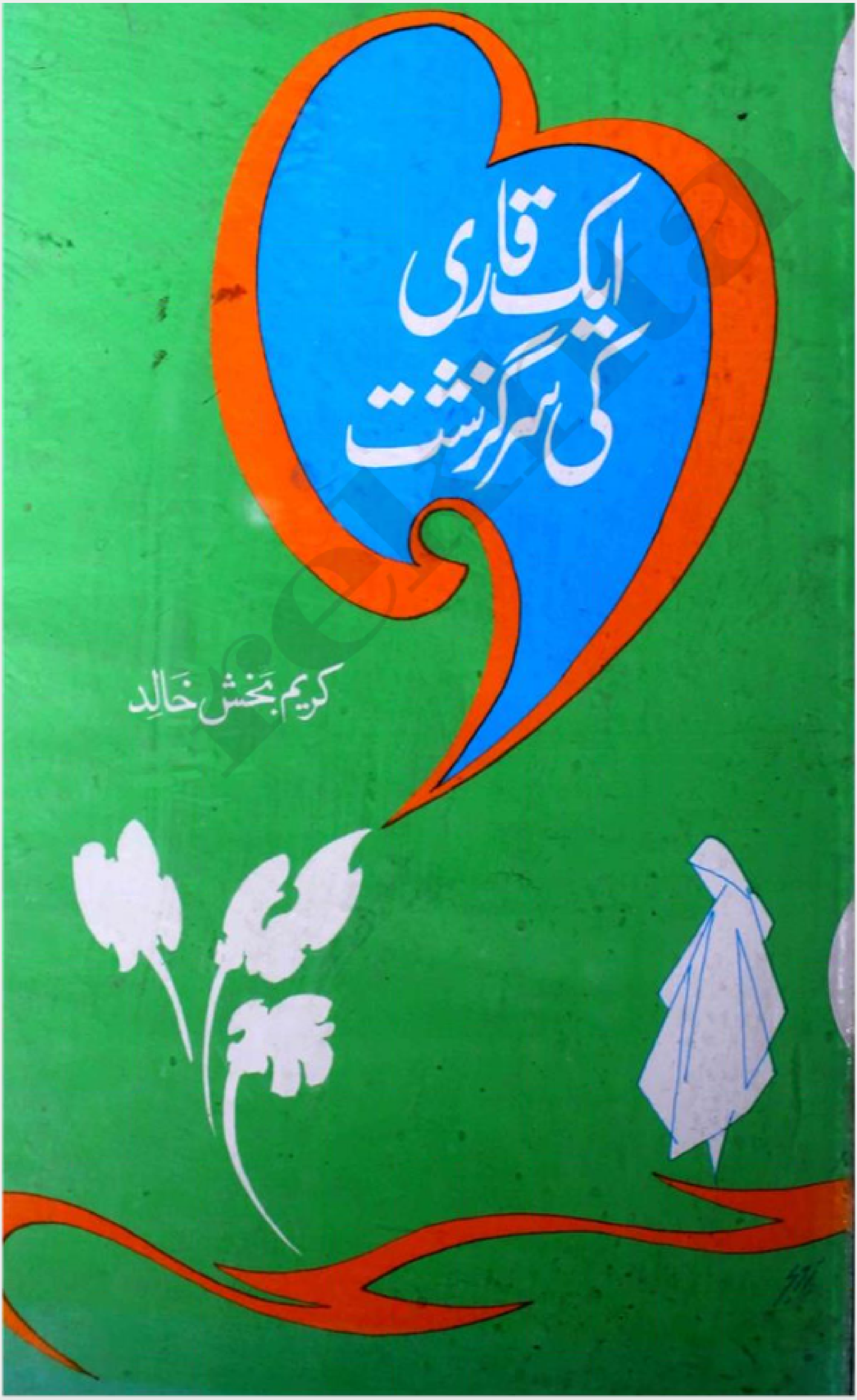

ایک قاری
کی سرگزشت
کریم بخش خالد

ایک قاری کی سرگزشت

کریم بخش خالد

"دنیا ایک آئینہ ہے اس کے سامنے آؤ،
اس میں تمہیں اپنا عکس دکھائی دے گا"
(عربی نغمہ)

پندرھویں صدی ہجری مطبوعات، کراچی-74400

پندرھویں صدی ہجری مطبوعات - ۵

کتاب : ایک قاری کی سرگزشت

مصنّف : کریم بخش خالد

ٹائیٹل : آذر زوبی

تزئین : سلطان احمد جیلانی، محمد اقبال

مطبع : ایجوکیشنل پریس، ضیاءالدین احمد روڈ، کراچی۔

تعداد : ایک ہزار (جون ۱۹۸۹ء)

قیمت : ۱۰۰ (ایک صد) روپے

NAME OF BOOK:	EK QARI KI SARGUZASHT
AUTHOR:	KARIM BAKHSH KHALID
GOVER DESIGN:	OZZIR ZUBY
PUBLISHER:	PANDERAHEEN SADI HIJRI PUBLICATIONS, C-1/4, JACOBLINES HOUSING COMPLEX, KARACHI-74400
FIRST EDITION:	JUNE 1989- 1000 COPIES
PRINTER:	EDUCATIONAL PRESS, ZIAUDDING AHMAD ROAD, KARACHI.
PRICE:	Rs.100/-

ایک قاری کی سرگزشت

کریم بخش خالد

"دنیا ایک آئینہ ہے اس کے سامنے آؤ،
اس میں تمہیں اپنا عکس دکھائی دے گا"
(عربی نغمہ)

پندرھویں صدی ہجری مطبوعات کراچی-74400

پندرھویں صدی ہجری مطبوعات - ۵

کتاب : ایک قاری کی سرگزشت
مصنف : کریم بخش خالد
ٹائیٹل : آذر زوبی
تزئین : سلطان احمد جیلانی، محمد اقبال
مطبع : ایجوکیشنل پریس، ضیاءالدین احمد روڈ، کراچی۔
تعداد : ایک ہزار (جون ۱۹۸۹ء)
قیمت : ۱۰۰ (ایک صد) روپے

NAME OF BOOK:	EK QARI KI SARGUZASHT
AUTHOR:	KARIM BAKHSH KHALID
GOVER DESIGN:	OZZIR ZUBY
PUBLISHER:	PANDERAHEEN SADI HIJRI PUBLICATIONS, C-1/4, JACOBLINES HOUSING COMPLEX, KARACHI-74400
FIRST EDITION:	JUNE 1989- 1000 COPIES
PRINTER:	EDUCATIONAL-PRESS, ZIAUDDING AHMAD ROAD, KARACHI.
PRICE:	Rs.100/-

مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ

جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا
بھی شکر گزار نہیں ہوگا۔ (قولِ رسولؐ)

محترم سلیم عباس جیلانی
کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	۹
۲	ادبی نصب العین	۱۷
۳	ایک قاری کی سرگزشت	۴۵
۴	ذکرِ حبیبؐ	۵۵
۵	سرودِ طیبہ	۶۵
۶	حمد و نعت	۷۱
۷	محمد رسول اللہؐ	۷۷
۸	کراچی سے گنبدِ خضرا تک	۸۷
۹	مدینہ منورہ کی عظمت و محبوبیت	۹۹
۱۰	سیاحتِ ممالکِ اسلامیہ	۱۰۷
۱۱	محترم	۱۲۵
۱۲	مفکرِ تہران	۱۳۹
۱۳	شاہ جو رسالو (اردو منظوم ترجمہ)	۱۵۳
۱۴	ابیاتِ سندھی	۱۷۵

نمبرشمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۵	مہران نقش	۱۸۱
۱۶	جامی	۱۹۳
۱۷	چھپائے نہ بنے	۱۹۹
۱۸	اصولِ قانون	۲۰۷
۱۹	حقیقتِ شاعری	۲۱۱
۲۰	نئی نظم اور پورا آدمی	۲۲۱
۲۱	شاخسار	۲۳۱
۲۲	دیدۂ خوش خواب	۲۴۱
۲۳	پاکستان زندہ باد	۲۴۷
۲۴	قائدِ اعظم کی حب الوطنی	۲۵۷
۲۵	مسلم خاتون اور مسئلۂ امارت	۲۷۵
۲۶	حیات نامہ	۲۹۹

—ooo—

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

خداوندِ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا، اس کو علم کی نعمت سے نوازا اور بیان کی قوت عطا کی۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر یہ عظیم احسان ہے کہ انہوں نے خداشناسی اور خود شناسی کی راہ دکھائی اور مومنوں کو اپنی معلومات دوسروں تک پہنچانے کی تلقین فرمائی۔

میں نے ۱۹۴۶ سے مختلف موضوعات پر اخبارات اور رسائل میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ میں سندھی روزنامہ 'الوحید' (کراچی) میں 'پس منظر' کے زیرِ عنوان اور ۱۹۶۱ میں سندھی روزنامہ 'عبرت' (حیدرآباد، سندھ) میں 'رفتارِ ادب' کے زیرِ عنوان طویل سلسلہ کالم نویسی نے مجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا اور آج تک تاریخ، ادب، ثقافت اور حالاتِ حاضرہ کے بارے میں میرے سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تحریریں زیادہ تر سندھی زبان میں ہیں۔ ان تحریروں کے انتخاب پر مشتمل میری پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں: سندھی صحافت (۱۹۵۵ء)، نظارو نیئنہ جو (۱۹۸۲ء)، سچل سائیں (۱۹۸۳ء)، وطایو فقیر (۱۹۸۵ء) اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱۹۸۷ء)۔ مزید بارہ (۱۲) کتابیں تدوین و طباعت کے مراحل میں ہیں۔

اردو میں میری پہلی تحریر ۱۹۵۹ میں روزنامہ 'جنگ' کراچی میں شائع ہوئی۔

اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۷۶ میں مجھے محکمہ اطلاعات سندھ کے دو ماہناموں کی ادارت کا کام سونپا گیا۔ ان میں ایک ماہنامہ "پیام" تھا جس کا نام ۱۹۷۹ میں تبدیل کر کے "اظہار" رکھا گیا۔ اس جریدے کے ذریعے دس برس تک میں نے نہ صرف اردو نثر نویسی میں مشق کی بلکہ اردو ادب کی حتی المقدور خدمت کی اور مختلف موضوعات پر ایک سو سے زائد مضامین لکھے۔ معاشرتی اور معاشی مصروفیتوں کے منجھدھار سے خوش اسلوبی سے گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تخلیقی کام سرانجام دینے کے سلسلے میں جس دلجمعی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مشکل سے حاصل ہوتی ہے، تاہم خداوند کریم کا بڑا فضل و کرم ہے کہ ان تحریروں اور تقاریر کے ذریعے میری پذیرائی ہوئی اور مجھے استحقاق سے بڑھ کر عزت اور محبت ملی۔ یہ انکساری نہیں بلکہ کلمۂ حقیقت ہے۔

اردو زبان میں یہ میری پہلی تالیف ہے جو منتخب تبصروں پر مشتمل ہے۔ اکثر مضامین تعارفی تقریبات میں پڑھے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں نقدِ ادب کی سی گہرائی اور تحقیق کا پہلو نمایاں نہیں۔ درحقیقت کتاب کی بھی ایک مکمل شخصیت ہوتی ہے اور تصنیف کے سلسلے میں محنتِ شاقہ کا بڑا حصہ تنقیدی محنت کا ہوتا ہے یعنی مواد کی چھان بین، اصلاح اور موزوں و مربوط ترتیب کا عمل اتنا ہی اذیت ناک اور محنت طلب ہوتا ہے جیسے شخصیت کی تشکیل و تعمیر کا عمل۔ ایک تربیت یافتہ اور ہنرمند مصنف جو تنقید اپنی تصنیف پر کرتا ہے، وہ بے حد اہم ہوتی ہے۔ بعض تخلیقی مصنف دوسروں سے محض اس بنا پر بہتر ہوتے ہیں کہ ان کا تنقیدی شعور اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ بہت سے تخلیقی مصنف تنقیدی شعور تو رکھتے ہیں لیکن وہ پوری طرح ان کی تصنیف میں شریک نہیں ہوتا۔ بہرحال تخلیقی عمل میں

فکر و نظر کا مطلق فقدان نہیں ہوتا۔

علامہ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ ادبیات میں تین مختلف قوتیں سرگرم پائی جاتی ہیں۔ ایک قوتِ تصنیف، دوسری لذت اندوزی اور تیسری قوتِ انتقاد۔ اس میں شک نہیں کہ ذوقِ نقد ایک فطری جذبہ ہے جو ہماری روزمرہ میں مختلف زاویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس فن نے ادبیات کو کس حد تک متاثر کیا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں البتہ عام زویہ ہے کہ تصانیف اور ان کے موضوع سے بحث کی جائے اور مصنف و زمانۂ تصنیف کی باہمی مناسبت ظاہر کر کے ان کتابوں سے مقابلہ کیا جائے جو کسی مخصوص موضوع پر مختلف ملکوں اور زمانوں میں لکھی گئیں علمی رایوں پر اظہار کرنا نقاد کا کام نہیں ہے کیونکہ نقاد کے لئے ہر موضوع میں مہارتِ تامہ رکھنا ضروری نہیں۔ البتہ ہر عہد اور ہر ملک کی علمی تاریخ سے اس کا آگاہ ہونا یقیناً لازم ہے اس لئے کہ فنِ نقد اور تاریخ علم و ادب میں باہم ربط پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کسی کتاب پر تنقید کی جائے تو پہلے اس کو غور سے پڑھ کر سمجھ لینا چاہیئے اور اس کے ساتھ اس موضوع کی اور کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر کتاب کا کوئی درجہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ نقاد کو بتانا پڑتا ہے کہ علم و ادب کی تاریخ میں زیرِ نقد کتاب کس درجہ میں رکھے جانے کی مستحق ہے۔ اس کے مضامین کو موضوع سے کہاں تک مناسبت ہے، عصرِ حاضر سے اس کا کیا تعلق ہے اور تصنیف کو مصنف اور اس کے ماحول سے کیا نسبت حاصل ہے۔ نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ذاتی میلان اور انفرادی ذوق سے علیحدہ ہو کر کتاب کے موضوع کے لحاظ سے منصفانہ رائے قائم کرے، اس کے محاسن اور معائب پر انصاف سے قلم اٹھائے اور اظہارِ حقیقت کے سوائے کوئی اور غرض اس کے پیشِ نظر نہ ہو۔ اس

لئے بہتر نقاد وہی ہو سکتا ہے جو کسی خاص فن یا موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو بلکہ عام علمی مذاق رکھتا ہو۔

ماحول ادیب کو پیدا کرتا ہے مگر ادیب ماحول کی از سرِ نو تعمیر میں مدد کرتا ہے۔ ادب بیک وقت حال کی آواز اور مستقبل کی بشارت ہے۔ سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو حال اور مستقبل کو ایک آہنگ بنا کر پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں وہ سب واقعات کی کثیف دنیا میں گردن تک ڈوبے کھڑے ہیں مگر ان کے ہاتھ ستاروں کو پکڑنے کے لئے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے ہیں۔

موجودہ دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شعبے میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانی قدروں کی عمارتیں گرتی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی قدروں کے ایسے رنگ محل تعمیر ہو رہے ہیں جن میں نئے افکار و خیالات نے اپنی محفلیں سجا رکھی ہیں۔ اصلاح کا خیال بھی عام ہو رہا ہے اور اس کے نتیجے میں پرانی روایات اور قدروں میں نیا خونِ زندگی دوڑانے کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ ہر شخص کے سر میں نیا سودا ہے۔ ادیب کو اس صورتِ حال کا ترجمان اور نقاد ہونا چاہئے۔ زمان و مکان کی عکاسی کرنی چاہئے۔ خیال بغیر مادّے کے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بڑی بات حالیؔ نے کہی تھی۔ اس خیال نے ہماری زندگی پر چھائی ہوئی عینیت اور تصوریت کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ حالیؔ کے نظریے کے مطابق ادب صرف تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی مقصد بھی ہوتا ہے۔ یہ مقصدیت اور افادیت اجتماعی زندگی کی ترجمانی میں خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے اور ادب میں اس اجتماعی اور سماجی زندگی کی ترجمانی ضروری ہے۔ ادیب کا مقصد سماجی حالات کی نہ صرف ترجمانی اور عکاسی، بلکہ تنقید بھی ہونا چاہئے۔ سماجی اصلاح کے خیال کے ساتھ ادب کے جمالیاتی پہلو کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔ چنانچہ اسلوب،

اندازِ بیان اور طرزِ ادا کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان خیالات و نظریات سے نئی روایات ضرور بنائی جائیں لیکن ہمارے ماضی کا ادبی ورثہ اتنا متنوع اور جاندار ہے کہ اس کے اثرات اب بھی ناگزیر ہیں۔ ہم اس ورثہ کو مزید نکھار سکتے ہیں اور اسے فروغ دے سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو جس میں واقعیت اور تخئیلیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کو یہی ہونا ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا ! (اقبالؔ: ضربِ کلیم)

میرے مضامین میں ان ہی نظریات کا پرتو نظر آئے گا۔ میں ایک مزدور قلمکار ہوں، معاشی اور معاشرتی مصروفیات کی وجہ سے، ادب سے میری کل وقتی وابستگی نہیں نیز اردو میری مادری زبان نہیں گو اس سے میرے عشق کی کیفیت مجنونانہ نوعیت کی رہی ہے۔ عشق میں آزمائش شرط ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس آزمائش میں کامیاب ہوں گا۔

جناب صادق الخیری (ولادت: دہلی ١١ مئی ١٩١٦ء۔ وفات: کراچی ٢٦ جنوری ١٩٨٩ء۔ مدفن: سخی حسن) نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھنا تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتے تھے اور میری تحریروں کے مداح تھے۔ دسمبر ١٩٨٨ء میں انہوں نے مجھ سے ملنے کا شدت سے اشتیاق ظاہر کیا۔ دو بار ٹیلیفون بھی کیا لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں ان کی محبانہ صحبت اور آخری دیدار سے محروم رہا۔ وہ

ہوئی تو انہوں نے تھک کر مجھ سے اس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ سے ملنے اور ان کا کام کروانے کی خواہش کی۔ میں ان افسرِ اعلیٰ سے ملا تو وہ بے حد خندہ پیشانی سے پیش آئے دفتری کارروائیاں مختصر کیں اور ان صاحب کا کام جلدی جلدی ہوگیا۔ چلتے وقت ان صاحب نے بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا اور ہنس کر کہا "تھوڑی سی بخشش چاہیئے"۔ میں نہ سمجھ سکا تو انہوں نے وضاحت کی کہ آپ کی فلاں فلاں کتابیں خریدی ہیں فلاں فلاں رہ گئی ہیں کیونکہ جیب خالی ہوگئی تھی۔ آپ عنایت کریں تو مہربانی ہوگی۔

"یہ صاحب کریم بخش خالد ہیں جو کتابیں خرید کر پڑھتے اور جمع کرتے ہیں خریدنے کا موقع نہ ہو تو مصنف سے بلا جھجک طلب کرلیتے ہیں۔ سنا ہے ان کے پاس قدیم اور جدید علوم کی بے شمار کتابیں ہیں مگر اپنی لائبریری کو سینت کر رکھتے ہیں۔ دوسروں سے کتابیں بڑی محبت سے وصول کرتے ہیں، کوئی ان کے کتب خانے کی کتاب یا مخطوطہ مانگے تو محبت سے معذرت کرلیتے ہیں۔

"کریم بخش خالد بہت صاف اور سیدھی اور معنی خیز عبارت لکھنے میں مشہور ہیں۔ مجھ سے وقتاً فوقتاً ملنا جلنا ہوتا ہے اور کبھی کبھار خط و کتابت بھی۔"

میں ان بے شمار مصنفین اور مقالہ نگاروں کا بھی شکر گزار ہوں جن کی نگارشات کے مطالعہ سے مجھے اردو نثر نویسی کے میدان میں قدم بڑھانے کی ہمت ہوئی۔ میں جناب پیر حسام الدین راشدی مرحوم اور محترم مشفق خواجہ صاحب کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر سطح پر میری بہت ہمت افزائی کی۔ نیز میرے وہ مخلص رفقائے کار بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے میری تحریریں کو پڑھا اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ اپنے خیالات سے مجھے استفادہ کرنے کا

نہایت عمدہ نثر لکھتے تھے۔ ایسے صاحبِ علم اور فکر و نظر کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ربِ رحیم و کریم انہیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازے اور روزِ محشر رسولِ رحمتؐ کے حلقۂ غلاماں میں جگہ عطا فرمائے۔

محترم صادق الخیری نے اپنی کتاب "گنجینۂ گوہر کھلا" (۱۹۸۵) میں میرے متعلق بھی ایک خاکہ شامل کیا تھا۔ ان کی محبت کو تازہ رکھنے کے لئے میں اس تحریر کو بطور پیش لفظ شامل کرتا ہوں۔

"سندھ کے محترم دانشور، کریم بخش خالد، سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں دادِ فصاحت دیتے ہیں۔ انہیں سندھی کو اردو سے قریب لانے اور سندھی خزینہ ادب کو اردو داں طبقہ سے روشناس کرانے کا خاص ذوق ہے۔ ان کے مضامین اور تقریریں پُر از معلومات اور انتہائی دلچسپ ہوتی ہیں۔ ان سے ملئے تو ادب سے لے کر صحافت تک اور صحافت سے لے کر سیاست تک ان کی زبان کترنی کی طرح چلتی ہے۔ سندھ کے سیاسی حالات، تحریک پاکستان اور بزرگ زعما کے ایسے ایسے حالات سناتے ہیں جو اب صحیح صحیح بتانے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ محنتی ہیں۔ مطالعہ کا جنون ہے اور کتابیں جمع کرنے کا وہ شوق فراواں ہے جو علم دوست سندھی گھرانوں کا عام شیوہ ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں کلرکی سے ابتدا کی اور اپنی محنت اور ریاضت سے (محکمہ اطلاعات) حکومت سندھ میں ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ابھی بڑھاپا نہیں آیا اس لئے اپنے علم و فضیلت اور کارکردگی کی بنا پر بہت ترقی کریں گے۔

"میری ان سے ملاقات ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ میرے ایک دوست کو ان سے کوئی کام تھا۔ ان کے دفتر کے بہت سے چکر لگائے، دال گلتی معلوم نہیں

موقع فراہم کیا۔

کریم بخش خالد

۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء

فلیٹ نمبر ۴/۱، بلاک 'سی'
جیکب لائینس ہاؤسنگ کمپلیکس،
کراچی-74400

ادبی نصب العین

محترم کریم بخش خالد صاحب کا شمار ان گنی چنی شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو بھی رونق بخشتے ہیں۔ یہ عزت افزائی زبانی نہیں بلکہ تحریری طور پر بھی ہوتی ہے بلکہ وہ عملی طور پر اتنا کچھ کر چکے ہیں اور کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں جو اس خود غرض معاشرے میں بذاتِ خود ایک حیرتناک بات ہے۔ کتابوں کی رونمائی ہو، کوئی ادبی اجتماع ہو، سرکاری تقریب ہو یا نئی نسل کا کوئی فنکشن ہو ہر سطح اور ہر انجمن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کریم بخش خالد صاحب کو بطور مہمانِ خصوصی یا مقرر مدعو کرے۔ ان کی یہ اعانت ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جو اثر و رسوخ رکھنے کے باوجود بھی بے فیض ہوتے ہیں۔ وہ چراغ ہی کیا جس کے تلے اندھیرا ہو۔

ایک روز ہم نے خالد صاحب کو فرصت میں پا کر روزنامہ 'نوائے وقت' (کراچی) کے لئے انٹرویو کیا۔ انہوں نے نہایت فراخدلی اور تفصیل سے اپنی ساٹھ سالہ زندگی کی سرگذشت کے اہم واقعات سنائے۔ اپنی کامیابیوں اور محرومیوں کا ذکر کیا۔ ادبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی مسائل پر گفتگو کی۔ اس طویل انٹرویو کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ (نسیم تقوی)

سوال:- خالد صاحب آپ اپنی تعلیم و تربیت سے متعلق فرمائیے۔

جواب:- میں نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے آبائی گاؤں میں مدرسہ

چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی - ایک سال تک شکارپور میں میرا قیام رہا - پہلے مولوی عبدالحق صاحب سے فارسی پڑھی پھر حکیم عبدالمجید صاحب کے مطب میں پنسار کا کام کرنے لگا اور ان سے بھی فارسی پڑھتا رہا - کچھ عرصہ بعد مڈل اسکول اسکالرشپ کا امتحان دیا اور گڑھی یاسین میں گرونانک اکیڈمی میں داخلہ لیا - پانچ سال کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول شکارپور میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۴۷ میں میٹرک پاس کیا - ہائی اسکول میں پہلے میں خاکسار تھا بعد میں تحریک پاکستان کے دوران مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام مسلم لیگ کا ورک کرتا رہا - اسکول مانیٹر، ہاسٹل کا ناظم اعلیٰ (ریفیکیٹ)، مطبخ (میس) کا منیجر تھا، علاوہ ازیں مسجد میں پیش امام تھا اور قرآن بھی پڑھتا تھا - میں مشہور سندھی ماہنامہ 'توحید' کراچی کا باقاعدہ قاری تھا - عربی سیکھنے میں بھی دلچسپی بڑھتی رہی - شمس العلما علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ سے، جو اس زمانے میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، سندھ تھے، ایک خط میں عربی سے دلچسپی کا اظہار کیا - موصوف نے میرے لئے نصابی کتابیں بھجوادیں اور میرے اساتذہ کو لکھا کہ اس طالبِ علم کا خاص خیال رکھا جائے - آغا گل حسن خان سابق نائب وزیر ریاست خیرپور (سندھ) بھی میری حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے - آپ آغا صوفی کے والد گرامی تھے - آغا صوفی وہ مشہور صوفی عالم تھے جنہوں نے سچل سائیں کا کلام مرتب کرکے سندھی ٹائپ میں رسالہ شائع کیا تھا -

اسی دور کی ایک اہم بات آپ کو بتا دوں - میں ان دنوں چار آنے اجرت پر تین گھنٹے ایک بزاز کی دوکان پر پنکھا کھینچتا تھا - شکارپور میں اس وقت دو سینما گھر تھے - ان دنوں میں نے کوئی ایسی اردو فلم نہیں ہوگی جو دیکھی نہ ہو -

مجیدیہ سے کیا تھا جو میرے والد بزرگوار مرحوم اور ان کے رفیق کار حبیب اللہ خان بارکزئی صاحب نے قائم کیا تھا - میں نے گڑھی یاسین میں قاری مولوی زر محمد پٹھان مرحوم سے بہت کچھ سیکھا - وہ عمدہ مقرر تھے اور پُرتاثیر وعظ فرماتے تھے نیز سیاسی رجحانات رکھتے تھے اس لئے ان سے سیاسی تربیت بھی ملتی رہی - مولوی صاحب خلافتی تھے اس لئے کانگریس کے حامی تھے - بجنور سے ایک اخبار 'مدینہ' ان کے پاس آتا تھا - اسی طرح بمبئی سے 'خلافت' بھی ان کو ملتا رہتا تھا - میں یہ اخبارات پڑھتا تھا - ہمارے شہر سے ایک ہفت روزہ سندھی اخبار 'پیغام صلح' نکلتا تھا وہ بھی میرے زیرِ مطالعہ رہا - آغا بدرالدین درانی علیگڑھ سے واپس آئے تھے - آغا صاحب کے والد شمس الدین خان بارکزئی ۱۹۳۷ میں سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے - آغا صاحب کے یہاں مجھے 'زمیندار' اور 'احسان' جیسے اخبارات پڑھنے کو ملے - اس زمانہ میں ان کے یہاں مشہور رسالہ 'عصمت' بھی آتا تھا - اپنے طالبِ علمی کے دور میں ایک رسالہ 'مومن' پڑھتا تھا جس کے ایڈیٹر عبدالمجید خان تھے - وہ مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے - اس رسالہ کے مقابلے میں مسلمانوں کا ہی ایک کانگریس پرست رسالہ 'پیشوا' نکلتا تھا جس کے مدیر عزیز حسن بقائی صاحب تھے - اسی طرح نیاز فتحپوری کے 'نگار' حکیم یوسف حسن کے 'نیرنگ خیال' اور ماہنامہ 'عالمگیر' کے مطالعے سے میرے ادبی ذوق کو جلا ملی - 'عالمگیر' کے ذریعے میں ماہرالقادری سے متعارف ہوا - رسالے میں شامل تصاویر کے عنوانات کے بجائے ماہرالقادری صاحب کے نہایت عمدہ اور بامقصد اشعار ہوتے تھے - ان باتوں سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ سے ہی میرا اخبارات سے واسطہ رہا ہے -

اس چوٹی کی بدولت میں نے فلمیں دیکھ کر اردو بول چال سیکھی۔ ۱۹۴۷ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور تلاشِ معاش کے لئے کراچی آگیا جہاں سندھ مسلم (آرٹس) کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے گریجوئیشن کیا۔

سوال: ۔ کراچی میں آپ نے کن اہم شخصیات سے اکتساب علم کیا۔

جواب: ۔ میں کراچی میں سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ایس ایم کالج میں پڑھتا رہا۔ اس زمانہ کے مشہور سندھی روزنامہ 'الوحید' کے دفتر جاتا تھا جہاں شیخ عبدالمجید سندھی کی سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مولانا عبدالغفور سیتائی مرحوم، قاضی عبدالرحمٰن مرحوم جو 'الوحید' کے پہلے ایڈیٹر تھے اور خلافت تحریک کے اہم رہنما تھے ان سے بھی استفادہ کرتا رہا۔ میں یہاں مولوی ہدایت اللہ میمن کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں جو قصبہ ہالا (قدیم) کے رہنے والے تھے اور نقل مکانی کرکے کراچی آگئے تھے۔ انہوں نے مکرانی خاندان میں شادی کرلی تھی اور لیاری کے علاقے میں رہتے تھے۔ وہ بڑے عالم، مفتی، شاعر، اچھے انشاپرداز اور خطاط بھی تھے۔ ۱۹۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ماہنامہ 'توحید' میں پڑھا تھا کہ کافی علمی مواد چھوڑ گئے تھے۔ میں علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی کے ہمراہ ان کے گھر گیا جب ہم نے ان کے مسودات کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے 'ترجمان القرآن' پر اردو میں تنقید لکھی تھی۔ ڈاکٹر گربخشانی نے جو 'شاہ جو رسالو' مرتب کیا تھا اس پر بھی تنقید کی تھی۔ وہ 'شاہ جو رسالو' کی ازسرنو ترتیب دے رہے تھے اور رسالہ کا فارسی میں منظوم ترجمہ بھی کر رہے تھے جو نامکمل مسودہ کی

حالت میں دستیاب ہوا۔ علامہ مخدوم ہاشم ٹھٹوی کی بعض کتابوں کی نقلیں اور دوسرے عربی و فارسی مسودات بھی دستیاب ہوئے جو علامہ قاسمی کے پاس محفوظ ہیں۔ ہالائی صاحب کی کچھ کتابیں بعض عالموں کے ہاتھوں فروخت ہوگئیں۔ کراچی کے قیام کے دوران میں نے شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، جناب اللہ بخش کریم بخش بروہی (اے کے بروہی)، پیر سعید حسن، سید حسام الدین راشدی، جناب صمد شاہین، محترمہ رفیعہ پیرزادہ، پروفیسر الیاس احمد وغیرہ سے استفادہ کیا۔

سوال: ۔ کچھ آپ اپنی علمی اور تحقیقی کاموں کے بارے میں ہمیں بتائیں۔

جواب: ۔ میرا پہلا مضمون ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا جو علامہ اقبال پر لکھا گیا تھا۔ موضوع تھا خودی۔ شاہ لطیف کے یہاں بھی یہ چیز ملتی ہے لیکن دوسرے زاویہ اور مطالب کے ساتھ۔ یہ تو تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ صداقت ازلی ہوتی ہے۔ وہ ایک سرچشمہ ہے۔ مختلف افراد نے مختلف اوقات میں اپنے ماحول کے مطابق اس کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ المیہ ہے جس کا میں نے علامہ اقبال پر ایک اور مضمون میں ذکر کیا تھا کہ میجر راورٹی کے انگریزی ترجمہ سے علامہ صاحب خوشحال خان خٹک تک پہنچ گئے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد پہ کوئی مقدمہ چلا تھا جس کے سلسلے میں وہ بلوچستان بھی گئے تھے۔ انہوں نے بلوچوں میں بیداری پیدا کرنے کے سلسلے میں نظمیں بھی لکھیں۔ علامہ آئی آئی قاضی مرحوم اور ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے آپس میں بہت اچھے مراسم تھے اور انہوں نے بہت سے علمی اور فلسفیانہ مسائل پر گفتگو بھی کی۔ قاضی صاحب کی تحریروں اور خطبوں میں ایسے اشارے ملتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اردو کے سندھی مرید شاہ لطیف کا پیغام اقبال تک نہیں پہنچا میرے

خیال میں اس کا یہی سبب ہے کہ ابتدائی دور میں علامہ اقبال تصوف کے خلاف تھے جیسے کہ انہوں نے حافظ پر سخت تنقید کی تھی۔ ان کی محفلوں میں صوفی شعرا مثلاً خواجہ فرید، بلھے شاہ، وارث شاہ وغیرہ کا ذکر تو ہوتا تھا لیکن کلامِ اقبال میں ایسا کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر اقبال کی شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ابیات تک رسائی ہوتی تو ان کے 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بیخودی' کا رنگ ہی دوسرا ہوتا۔

میں نے سندھی، اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر تقریباً ایک ہزار سے زائد مضامین تحریر کئے ہیں جن میں سے بیشتر کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ میری تصنیفات کی تعداد ۳۳ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے چوالیس کتابوں اور رسائل کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ مختلف موضوعات پر تقریباً چودہ کتابیں تدوین و طباعت کے مراحل میں ہیں۔

سوال: سندھی زبان و ادب کی ترویج میں غیر مسلموں نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

جواب:۔ انہوں نے سندھی زبان و ادب کی ترویج میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ ۱۸۵۳ء میں سندھی کا جو موجودہ اسکرپٹ ہے اس کو حتمی طور پر اختیار کیا گیا۔ وقت کی ضرورت تھی کہ انگریز حاکم اپنے ادب کو بھی یہاں متعارف کرائیں۔ ہندوؤں نے جغرافیہ اور تاریخ سے متعلق کتابوں کے تراجم کئے۔ انگریزی کتابوں خاص طور پر ناولوں کے تراجم ہوئے۔ اس زمانے میں محکمہ تعلیم میں مسلمان کم تھے اور جدید علوم کی جانب مسلمان دیر سے آئے البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوؤں نے شمس العلما مرزا قلیچ بیگ جیسا آدمی پیدا نہیں کیا جو ادب کے ہر شعبہ میں دسترس رکھتا تھا۔ انہوں نے ہر موضوع پر کتابیں تحریر

کی ہیں۔

ایک مشہور سندھی ادیب پرمانند تھا جو بہت متعصب تھا۔ اس نے 'انگلش ٹو سندھی' اور 'سندھی ٹو انگلش' ڈکشنریاں ترتیب دی تھیں۔ تعصب کی انتہا دیکھئے۔ سندھی ٹو انگلش ڈکشنری میں 'جٹ' کے معنی انگریزی میں 'سندھی مسلمان' بتائے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جدید علوم سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بھی اس کی ہندو ذہنیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ ہندو سے عیسائی ہو گیا تھا۔ دیوان کوڑومل، بھیرومل اور جیٹھ مل پرسرام نے سندھی زبان کی بڑی خدمت کی۔ چند ہندو 'تھیاسوفسٹ' تھے۔ وہ مذہب کو نیکی اور اخلاقیات کے حوالے سے انسان کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ لال چند امرڈنومل نے بھی سندھی زبان کی خدمت کی۔ ڈاکٹر گربخشانی جدید تعلیم کے پروردہ تھے اور ڈی جے سائنس کالج میں فارسی پڑھاتے تھے۔ انہیں 'شاہ جو رسالو' مرتب کرنے کی وجہ سے شہرت ملی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ چوتھی جلد وہ مرتب نہ کر سکے تھے۔ چند مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا تھا جن میں علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ کا نام سرِ فہرست ہے جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر گربخشانی کے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے ایک اور کتاب 'لواری جا لال' تحریر کی تھی۔ ڈاکٹر گربخشانی کی ایک اور مشہور کتاب 'نورجہاں' ہے۔ لیکن وہ ایک بات ہے نا جب کوئی تاریخی ناول لکھا جائے تو تاریخی حقائق کو برقرار رکھا جائے لیکن انہوں نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں شاید دلچسپ بنانے کے لئے یا کوئی اور بات تھی جس پر کافی اعتراضات ہوئے۔ اسی طرح 'شاہ جو رسالو' کا جو مقدمہ ہے اس میں انہوں نے ایک باب

تصوف پر لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ تصوف ویدانت کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی اصل جو ہے وہ ویدانت ہے یعنی ہندو "مسٹزم"۔ اس پر اس وقت کے جید علما نے اعتراضات کئے تھے۔ اس کے علاوہ "شاہ جو رسالو" کا جو مواد انہیں ملا تھا، اس کی قطع برید کر کے اختصار کے ساتھ یہ رسالہ مرتب کیا۔ ان کا استدلال تھا کہ وہ کلام شاہ لطیف کا نہیں ہے۔ معترضین کا خیال تھا کہ اگر یہ کلام دوسرے شعرا کا بھی تھا تو اسے ضائع کرنا نہیں چاہیئے تھا۔ اگر وہ محفوظ رہتا تو اچھا تھا۔ ہمیں اب علم نہیں کہ وہ کلام جو انہوں نے مسترد کیا تھا وہ کہاں ہے

کلیان آڈوانی نے بھی سندھی زبان و ادب کے لئے کام کیا ہے۔ انہوں نے "شاہ جو رسالو" مرتب کیا۔ شاہ لطیف اور سچل سرمست پر کتابیں لکھیں۔ شکارپور (سندھ) میں ایک ہندو صوفی شاعر گزرے ہیں جن کا کلام "سامی جا سلوک" کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر بھی کتاب تحریر کی۔ رام پنجوانی اچھے ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ عمدہ شاعر بھی تھے۔ کشن چند بیوس، ہری دلگیر، لیکھراج عزیز، کھیئل داس فانی، ہوندراج دکھایل، ہشو کیولرامانی، منگھارام ملکانی، نارائن بھارتی، گنگارام سمراٹ، چیتن ماڑیوالا، ڈاکٹر ہرومل سدارنگانی وغیرہ نے بھی سندھی ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح چندر نے بھی سنگیت کے ذریعہ سندھی زبان کو فروغ دیا۔ جدید سندھی ادب میں ڈاکٹر مرلی در جیٹلے، ڈاکٹر موتی پرکاش، اتم، تیرتھ وسنت سندری اور آہوجا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان میں قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ سندھی کا عربی اسکرپٹ برقرار رکھا گیا ہے۔ اب وہاں سندھی زبان

ہندی اور عربی اسکرپٹ میں لکھی جاتی ہے اور دستور میں شامل ۱۴-۲ اسٹیٹ لنگویجز میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

سوال :- سندھی نثر پر عربی اور فارسی اثرات کا جائزہ لیجئے۔

جواب :- عربی اور فارسی کے سندھی نثر پر کافی اثرات ہیں۔ سندھ کا قدیم ادب دینی نوعیت کا ہے۔ نثر ہو یا نظم اس میں اسلامی تشخص نمایاں ہے۔ رومانوی موضوعات ہوں تو بھی ان کی انتہا اللہ کی ذات پاک پر ہوتی ہے۔ جہ انسان اپنے کو کمزور و نحیف اور گناہ گار سمجھ کر دعا طلبی کرتا ہے۔

"اردو - ہندی تنازعہ" جیسی تحریک یہاں بھی چلی تھی کہ سندھی الفابیٹ میں سے عربی حروف نکال دیئے جائیں اور ان کے بجائے ہندی حروف استعمال کئے جائیں اور اعرابوں کے استعمال کو ختم کیا جائے لیکن ڈاکٹر داؤد پوتہ نے یہ مہم کامیاب ہونے نہیں دی۔ اس موضوع پر کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ہندوؤں کے اخبارات خاص طور پر "سنسار سماچار"، "ہندو"، "کیسری" اور "بھارت واسی" میں اسی انداز سے خبریں اور مضامین لکھے جانے لگے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد سندھی زبان اردو کے زیر اثر ہے اس لئے کہ ابلاغ کے زیادہ وسیع اور مؤثر ذرائع اردو میں ہیں۔ ظاہر ہے ہم سب مسلمان ہیں۔ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ ہماری سوچ کا سرچشمہ ایک ہے۔ عربی اور فارسی کے اثرات اب بھی بدستور قائم ہیں۔

سوال :- سندھی شاعری پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا اثرات مرتب کئے؟

جواب :- جس طرح اردو کی ابتدائی شاعری میں فارسی کا اتنا اثر نہیں

ہے اسی طرح سندھی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ ابتدائی سندھی شاعری میں ٹھیٹ سندھی الفاظ ہیں۔ اس میں مقامی سندھی ہے اور زبان کے مختلف لہجے۔ اس دور کی شاعری میں کچھ کا لہجہ نمایاں ہے۔ تھر کا ہے اور کوہستان کا لہجہ ہے۔ جب ایران اور ہندوستان سے شاعر سندھ میں آکر آباد ہوئے تو فارسی کا اثر بڑھنے لگا، خاص طور پر ٹالپر امیروں کے دور میں سندھی شاعری پر فارسی کے واضح اثرات مرتب ہوئے جو مختلف اصنافِ سخن میں نمایاں ہیں اس کے بعد یہ اثر کم ہونے لگا۔ جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک چلی تو ظاہر ہے اس کا اثر سندھ پر بھی پڑا۔ میں واضح طور پر یہ کہتا ہوں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے جب سندھ میں احساسِ محرومی پیدا ہوا تو اس کے اثرات سندھی شاعری پر بھی پڑے، ہیئت میں بھی تبدیلی آئی۔ اب گل و بلبل، زلف و رخسار اور کاکل و عارض کی پرانی موضوعاتی شاعری کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ محبوب کی بات ہو رہی ہے مگر محبوب اب زمین ہے کوئی نرم و نازک جسم نہیں ہے۔ اب شاعری میں ٹھیٹ سندھی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ غزل کے مقابلے میں نظم کو فروغ ملا ہے۔ نظم کے ساتھ ساتھ کافی، وائی اور بیت قاری کو متاثر کر رہی ہیں۔ خاص طور پر بیت میں فارسی اور عربی کے الفاظ نہیں آسکتے۔ بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ اب شاعری میں لیلیٰ مجنوں کا قصہ نہیں ہے۔ جدید شاعری میں سماجی زندگی اور اس کے مسائل کا خوب ذکر ہو رہا ہے۔

سوال: سندھی ادب میں اسلامی نظریات کے حوالے سے اظہارِ خیال فرمائیے۔

جواب: میں کمٹیڈ آدمی ہوں۔ میں کافی مطالعہ کرتا ہوں۔ موجودہ دور میں جو یہ نظریہ رکھتے ہیں ان کی پسپائی نظر آتی ہے۔ ہماری ابتدائی

شاعری میں اسلامی نظریات کا اظہار ملتا ہے۔ ہمارے کلاسیکی شعرا میں یہ بات ملتی ہے۔ سانگی کے کلام میں آپ دیکھیں۔ مرزا قلیچ بیگ کے دور کی شاعری تک اسلامی نظریات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اخلاقی باتیں ہیں۔ خدا اور رسول کا نام ہے۔ پند و نصائح اور ہدایت کی باتیں ملتی ہیں جبکہ اس جدید دور میں تفرقہ بازی ہے اس کی وجہ سے حسد اور رقابتیں پیدا ہوتی ہیں۔ افہام و تفہیم کی بات نہیں ہے۔ کوئی تبلیغ نہیں ہے۔ عفو و درگزر اور قوتِ برداشت کا جذبہ نہیں ہے۔ اسلام ہمیں امن و آشتی کا درس دیتا ہے۔ اسلام ہم کو اخوت سکھاتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ 'شرع مبین' کا کیا مقصد ہے۔ 'کس نہ باشد محتاج کس'۔ کوئی بندہ کسی بندے کا محتاج نہ ہو۔ یہ شرع کا سبق ہے۔ حقائق اسی طرح ہیں۔ اگر آپ مذہبی ادب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو کتابوں میں مختلف فرقے ایک دوسرے کی مٹی پلید کرتے ہیں۔ ان کتابوں کے ٹائیٹل دیکھ کر آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس ٹائٹل کا جو تقدس ہے اس کو کس طرح اندر متن میں پامال کیا گیا ہے۔ میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی انتخاب مرتب کیا جائے تو ۱۹۵۲ء تک سندھی ادب میں اسلامی تشخص بالکل واضح ہے۔ اس کے بعد یہ اثر زائل ہوتا جا رہا ہے۔

میں ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہوں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ کا بھی مشاہدہ ہوگا کہ نالائق لوگوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو فروغ دیں حالانکہ ان کا ذاتی کردار انتہائی پست ہوتا ہے۔ لوگ انہیں دیکھ کر نفرت کرتے ہیں۔ وہ جو کام کریں گے اس کی کیا پذیرائی ہوگی؟

سوال :- آپ کی نظر میں سندھ کی تاریخ کے سندھی ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ؟

جواب :- تاریخ ادب پر یقیناً اثر انداز ہوتی ہے - سندھ کی تاریخ جنگ و جدل کی داستان ہے - کبھی کبھی امن و آشتی کے دور بھی آئے - خوشحالی کے دن بھی آئے ورنہ سندھ میں سارا وقت جدوجہد میں گزرا ہے - نثر اور نظم میں قصے اور کہانیاں ہیں - رزمیہ شاعری ہے - ایسی چیزوں کو ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے لوک ادب پروگرام کے تحت مختلف جلدوں میں محفوظ کیا ہے - لوک ادب ایک تاریخی ورثہ ہے جسے شاعروں نے اپنے کلام میں محفوظ کر لیا تھا -

سوال :- شاہ لطیف سائیں کے متعلق تحقیق کا تاریخی جائزہ، اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں ؟

جواب :- میں نے بھی شاہ لطیف پر بہت لکھا ہے اور دیگر حضرات نے بھی - ان کے موضوع اور عنوان دلپذیر ہیں ان میں کشش ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان سب میں توصیفانہ انداز ملتا ہے - "شاہ جو رسالو" سب سے پہلے لیپسیا (جرمنی) میں طبع ہوا - ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے رسالہ کی ترتیب اور اشاعت سے متعلق قابل داد تحقیق کی ہے - اسی طرح انہوں نے شاہ صاحب کی حیات اور زمانے کے حالات، ان کے رسالہ کے سرچشمے اور مختلف اشاعتوں کے کوائف پر تحقیق کی ہے - آزادی سے پہلے شاہ لطیف پر اتنا کام ہوا کہ ان کے کلام کی حفاظت ہو سکے - "یوم شاہ لطیف" ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء کے بعد سے منایا جانے لگا - اس سے پہلے صرف عرس ہوتا تھا

اور فقرا یکتارے پر کلام گایا کرتے تھے یا جمعرات کو بھٹ شاہ میں سماع کی محفلیں ہوتی تھیں - آزادی کے بعد شاہ صاحب کو نیشنلزم کا استعارہ قرار دیا گیا - یہ بات پورے پاکستان میں رونما ہوئی - مثلاً سرحد میں خوشحال خان خٹک، پنجاب میں اقبال، اسی طرح سابق مشرقی پاکستان میں نذرالاسلام اور بلوچستان میں جام درک اور مست توکلی - بہرحال شاہ لطیف پر آزادی کے بعد سندھ میں تحقیق ہوئی - وہ کون تھے - ان کا خاندانی پس منظر کیا تھا - جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا شاہ صاحب پر زیادہ تر مضامین ایک جیسے ہیں - چند مضامین ایسے لکھے گئے ہیں جن میں گہرائی ہے - علامہ آئی آئی قاضی اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ اس سلسلے میں اہم نام ہیں - خاص طور پر ڈاکٹر بلوچ نے بڑی تحقیق کی ہے لیکن ایک اہم عنصر اس سلسلے میں ابھر رہا ہے - ایک نئی بات پیدا ہو رہی ہے - اردو میں شاہ صاحب پر مضامین اور مقالے لکھے جا رہے ہیں جو قابلِ تعریف اقدام ہے - میں سمجھتا ہوں دس سال کے عرصے میں لطیف سائیں کا مقام انتہائی بلند ہو جائے گا - ان کے کلام کے نئے تراجم جو منظوم ہیں بڑا تاثر لئے ہوئے ہیں - شیخ ایاز کا منظوم ترجمہ ہے جو آفاق صدیقی نے کیا تھا - اگر اس کتاب پر "شاہ جو رسالو کا اردو ترجمہ" نہ لکھا جائے تو لوگ اسے مترجم کا اپنا مجموعہ کلام سمجھنے میں حق بجانب ہونگے کیونکہ اس میں وہ بات ہی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ شاہ سائیں کا کلام ہے - اب جو شاہ صاحب پر اردو میں تخلیقات آ رہی ہیں وہ معیاری اور نئے نئے پہلو لئے ہوئے ہیں - اس کے بعد ہم ان کی عظمت کو پہچان سکیں گے - میں مایوس نہیں ہوں - زبانیں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں - کوئی

زبان مٹ نہیں سکتی صرف اس کا دائرہ کم ہوتا جاتا ہے کیونکہ ہم اس کو سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس کو فروغ بھی نہیں دے رہے۔ نئے نئے الفاظ، نئے محاورے، نئی اصطلاحات لائیں۔ اسی طرح زبانیں ترقی کرتی ہیں اور آگے بڑھتی ہیں۔ جس آدمی کا وسیع مطالعہ ہوگا وہی نئے نئے خزانے آپ کو دے سکتا ہے۔ ایسے ایسے نکتے ظاہر کر سکتا ہے جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوگا۔

سوال :۔ سندھی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے آپ کے نزدیک تخلیقات میں جامعیت پائی جاتی ہے؟

جواب :۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس موضوع پر اب تک کسی نے سلیقے سے نہیں لکھا۔ سندھ کے کلچر یا تہذیب پر کوئی ڈھنگ کی کتاب نہیں ملتی۔ سندھیالاجی نے اس موضوع پر ایک کتاب چھاپی تھی لیکن اس میں کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ کلچر کا نام لے کر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ رلکی پر جو مقبرے بنے ہیں ان میں سندھی طرز تعمیر کی کوئی نشانی نہیں ہے۔ سندھ میں سادہ مکانات بنائے جاتے ہیں۔ ان کو میں عمارت نہیں کہہ سکتا ہوں کیونکہ عمارت امارت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں ٹائیلز بنائے جاتے ہیں۔ یہ تو ہنرمندوں اور کاریگروں کی بات ہوئی۔ جی ایم سید صاحب نے کافی مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی نوعیت سیاسی ہے۔ وہ تہذیب و ثقافت کے نام پر سیاست بیان کرتے ہیں۔

سوال :۔ آزادی کے بعد سندھی ادب میں کیا نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں؟

جواب :۔ جی ہاں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ نیشنلزم بہت ابھرا ہے۔ محرومیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور ان کا ردِ عمل بھی شدت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کراچی اور حیدرآباد میں کارخانے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارا صوبہ صنعتی ہوگیا۔ صنعتی ماحول میں نئے تہذیبی رجحانات فروغ پاتے ہیں۔ سندھی ادب میں یہ بات نمایاں طور محسوس ہوتی ہے۔ سندھی ادب دیگر زبانوں کے ادب سے بھی بڑا متاثر ہوا ہے۔ افسانوں، ناولوں اور شاعری میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ ہیئت اور تیکنیک کے لحاظ سے یہ بین الاقوامی معیار پر ہیں مگر جغرافیائی حدود میں مقید ہیں۔ اس زبان کی پذیرائی ہوتی تو بات بنتی۔ شیخ ایاز، شیخ عبدالرزاق راز مرحوم، ابراہیم جویو، نیاز ہمایونی، جمال ابڑو، ڈاکٹر تنویر عباسی، سراج الحق میمن، شمشیر الحیدری، علی بابا، امر جلیل، غلام ربانی آگرو، رشید بھٹی، امداد حسینی، استاد بخاری، بردہ سندھی، تاج بلوچ، مراد علی مرزا، قمر شہباز، آغا سلیم، حمید سندھی، ناصر مرزائی، فتاح ملک، ولیرام ولبھ، ڈاکٹر ذوالفقار سیال، ممتاز مرزا، عبدالقادر جونیجو، کیہر شوکت اور یوسف شاہین نے، اور خواتین میں زینت چنا، مہتاب منور عباسی (حال مہتاب محبوب)، رشیدہ حجاب، بادام ناتواں، ثمیرہ زریں، سحر امداد، نورالہدیٰ شاہ، تنویر جونیجو، مریم مجیدی، سلطانہ وقاصی، خیرالنسا جعفری، روشن مغل، فہمیدہ حسین اور ثریا سوز ڈیپلائی نے سندھی ادب کو جدید اسلوب اور آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔

سوال :۔ کیا آپ موجودہ سندھی ادب کی تخلیقی رفتار سے مطمئن ہیں؟

جواب :۔ سندھی زبان میں کتابیں بہت شائع ہوئی ہیں لیکن ان کے مطالعے کا دائرہ بہت محدود ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ چند کتابیں پڑھنے کے بعد طلبا اپنی نصابی سرگرمیوں سے دور ہو جائیں اور شاعروں کے اشعار پر

عمل کرنا شروع کر دیں تو یہ تہذیب نہیں تخریب ہے۔ میں سندھی ادب کی موجودہ تخلیقی رفتار سے مطمئن نہیں ہوں۔ وہ ہماری ترجمانی اور رہنمائی نہیں کرتا۔ اگر رہنمائی کرتا ہے تو اس کشمکش میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

سوال :۔ اپنی قوم کی رہنمائی کے لئے دانشور کیا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب :۔ دانشوروں کا بڑا مقام ہے۔ دانشور کا اہم کام یہ ہے کہ خصوصی طور پر نوجوانوں کی ذہنی تربیت کرے۔ اگر دانشور یہ سمجھے کہ سورج سُرخ ہی ہوتا ہے تو یہ غلط بات ہے۔

سوال :۔ ہمارا قومی تشخص کیا ہے ؟

جواب :۔ اوّل و آخر ہم مسلمان ہیں۔ قومی تشخص کا مطلب کسی قوم کی منفرد پہچان ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ آنحضرت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک سے لگایا جا سکتا ہے "مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَہُوَ مِنْہُمْ" اس کا مطلب ہے کہ جس قوم نے کسی دوسری قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہو گیا۔ اس حدیث شریف میں مسلمانوں کو صاف صاف ہدایت ہے اور حکم بھی ہے کہ مسلمان کو اپنی پہچان غیر مسلم سے علیحدہ رکھنی چاہئیے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے مسلمان قوم دنیا میں علیحدہ مقام اور نام پیدا کر سکتی ہے۔ اس پہچان کو قومی تشخص کہتے ہیں۔ ہر آزاد قوم یا ملک کا اپنا اپنا تشخص ہوتا ہے اور اس ملک کی طاقت کا اندازہ اس کے تشخص ہی سے ہوتا ہے۔ جس درجہ قوم میں تشخص کا جذبہ اُبھرے گا اسی درجہ اس ملک کا مستقبل روشن ہو گا۔ ہمیں چاہئیے کہ ہم ہمدلی کے جذبہ کو فروغ دینے کے لئے ہم زبانی کی روایت کو مستحکم بنائیں اسے توسیع دیں

پنی روایات واقدار اپنی تہذیب وثقافت کو عملی زندگی کا شعار بنائیں تاکہ جذبہ حب الوطنی اُبھر سکے اور ہم سب کسی امتیاز کے بغیر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکیں۔

(انٹرویو، روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۷ راگست ۱۹۸۸ء)

(۲)

سوال :۔ ہمارا سماج اس وقت جس صورتِ حال سے گزر رہا ہے اس کی تاویل آپ کیسے کریں گے ؟

جواب :۔ بڑے کرب سے گزر رہا ہے۔ بڑی بے چینی ہے ذہنی سکون نہیں ہے۔

سوال :۔ اس کا جواز ؟

جواب :۔ جواز اس کا یہ ہے کہ توقعات تو باندھی گئی ہیں۔ ان توقعات کو پورا کرنے کے ذرائع بھی موجود ہیں لیکن فرد خود کوئی کام کرنے کو تیار نہیں۔ ہر فرد کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا جو کام ہے وہ خود بخود ہو جائے۔ وہ غیب سے امداد پر نظر لگائے ہوئے ہے۔

سوال :۔ آپ خود کس تجربے سے گزر رہے ہیں ؟

جواب :۔ یہی جو میں نے آپ سے بیان کیا، مسائل بہت ہیں کثیر الاولاد آدمی ہوں، ان کا حل میری انفرادی کوشش سے باہر ہے۔

سوال :۔ سندھی ادب میں کس قسم کے رجحانات نمایاں ہیں ؟

جواب :۔ یہ رجحان جدیدیت کی طرف زیادہ ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے

کہ سندھی ادب پر جو شروع سے مذہب کا غلبہ تھا وہ ٹوٹ رہا ہے۔

سوال :- آپ کے خیال میں اس کا سبب کیا ہے ؟

جواب :- اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مذہبی ادب یا ایسا ادب جس پر مذہب کا اثر ہو اس کی طرف بے اعتنائی برتی جا رہی ہے کیونکہ قارئین کا جو نیا طبقہ پیدا ہوا اس کی تعلیم و تربیت میں مذہب کا کوئی خاص عمل دخل نہیں رہا۔ پھر اس رجحان کو تقویت بیرونی ثقافتی یلغار سے بھی پہنچی، ایک سبب یہ بھی ہے کہ مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں کی سرپرستی اور پذیرائی نہیں ہے۔ مذہبی ادب جو سندھی زبان میں پیش کیا جا رہا ہے وہ جدید عصری تقاضوں کے مطابق نہیں۔ اب بھی قدیم طرز پہ بنیادی عقائد سے متعلق کام ہو رہا ہے۔ یعنی مذہب کو ہماری زندگی میں کیا رول ادا کرنا ہے اس پر کوئی توجہ نہیں۔ ابتدا میں تو یہی ٹھیک سمجھا جاتا تھا کہ بنیادی باتیں شروع میں بتا دی جائیں۔ لیکن آج جب اس قدر مسائل ہیں، معاشی، سیاسی، سماجی تو ان پر بھی دینی نقطہ نگاہ سے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ادب تخلیق ہونا چاہیئے۔

سوال :- سندھی ادب میں لکھنے والوں سے آپ مطمئن ہیں ؟

جواب :- یہ تو میں برملا کہہ سکتا ہوں کہ سندھی ادب میں اتنا کام نہیں ہو رہا جتنا شور و غل سندھی زبان کے لئے کیا جا رہا ہے کہ وہ ختم ہو جائیگی۔

سوال :- سندھی افسانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب :- سندھی افسانے نے بہت ترقی کی ہے۔ اگر ہم انکے ترجمے پیش کرسکیں تو دوسری زبانوں کے مقابلے میں مایوسی نہیں ہوگی۔

البتہ سندھی غزل دم توڑ رہی ہے۔ نظم نے کافی ترقی کی ہے۔ لیکن وائی نے جو سندھی کا قدیم شعری اثاثہ ہے بہت ترقی کی ہے۔ اسی طرح نئے اصنافِ سخن میں بھی کامیاب تجربے ہوئے ہیں۔ البتہ شاعری میں ایک نیا رجحان نظر آتا ہے وہ یہ کہ قدیم سندھی زبان زیادہ استعمال کی جا رہی ہے۔ فارسی طرز کی شاعری دم توڑتی نظر آتی ہے۔

سوال :- وجہ ؟

جواب :- میرے نقطہ نظر سے یہ ردِ عمل ہے اردو کے دامن کو پاکستانی زبانوں کے بجائے دوسری زبانوں سے جوڑنے اور بھرنے کا۔ غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات اور ثقافت استعمال کرنے کے بجائے اگر پاکستانی زبانوں کے الفاظ اور محاورے استعمال کئے جائیں تو یہ بہتر ہوگا۔ دوسرا ردِ عمل یہ بھی ہے کہ اردو میں پاکستانی زبانوں کے لفظوں کی پیوندکاری نہیں ہو رہی۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع کی روش سے یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ پاکستانی زبانوں کی اہمیت دن بدن کم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں اگر اردو ٹائپ کا زیادہ رواج ہوتا ہے تو لسانی اتحاد کا کام زیادہ خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

سوال :- ہمارے ہاں جیسی صورتحال کا سامنا اور بھی کئی ملکوں نے کیا ہے۔ لیکن وہاں کا ادب اور ادیب ہمارے ہاں کی طرح بے عمل اور بے اثر نہیں رہا ؟

جواب :- وہ جذبہ نہیں ہے۔ آزادی کے بعد زیادہ تر یہ سمجھا گیا کہ آزادی کے جو محرکات تھے وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ یہ تاثر عام ہوا کہ اب ہم آزاد ہیں، خود احتساب کا عمل جو آزادی سے پہلے بہت قوی تھا وہ اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ یہ جو عام

طور پر کہا جاتا ہے کہ اخلاقی قدریں تبدیل ہو گئی ہیں، مجھے یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اخلاق اور قدریں دو الگ الگ چیزیں ہیں یا اب انکے درمیان کوئی فرق پیدا ہو گیا جو اچھی چیز ہے اس کو ہم قدر کہتے ہیں، یہ تبدیل نہیں ہوئے بلکہ ہمارے برتنے کا انداز بدل گیا۔ ہمارے ملک میں یہ سب اس لئے ہوا کہ ہمارے ہاں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے۔ ہمارے سامنے کوئی آئیڈیل نہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کیا آئیڈیل رہا۔ ہمارا آئیڈیل ہر دور میں بدلتا رہا۔ جو VOCAL طبقہ تھا وہ اپنا آئیڈیل سامنے لے آیا اور جب تک ان میں طاقت رہی انہوں نے اپنے آئیڈیل کو آگے بڑھایا اور جیسے وہ کمزور ہوئے تو آئیڈیل بھی کمزور ہو کر مٹ گیا۔ تینتیس ۳۳ سال تک کتنی تحریکیں چلیں لیکن کوئی بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ تہذیب، کلچر، زبان وغیرہ ان سب چیزوں کو چھوڑ دیجئے۔ لوگ تو ملک کے وجود اور اس کی بقا پر بحث کر رہے ہیں۔ یہ بحث کسی اور ملک میں سننے کو نہیں ملے گی نہ ان اثرات کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔

سوال:۔ ان حالات کا سامنا تو اور بھی بہت سے ملکوں نے کیا ہے۔ مثلاً ایران، ویت نام، انگولا۔

جواب:۔ جن ممالک کا آپ نے نام لیا وہاں ایسی باتیں نہیں۔ ہم تو خوش قسمت ہیں کہ ہماری روایات و تاریخ بہت پرانی ہیں۔ پاکستان راتوں رات قائم نہیں ہوا تھا اس کے پس منظر میں افکار و نظریات تھے، جغرافیائی طور پہ ملک تو ملا لیکن نظریاتی طور پہ ہم کسی چیز کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

سوال:۔ آج کی جو پیچیدہ صورت حال ہے، کیا ہمارا ادیب اور ادب معاشرے کو اس صورت حال سے نکالنے میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟

جواب:۔ بالکل کامیاب ہو سکتے ہیں اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے ادیب اپنے وجود کو سمجھیں کہ وہ کیا ہیں کیا کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات پھر خود احتسابی پر آتی ہے۔ اگر ادیب یہ کہتا ہے کہ ویت نام میں یہ ہوا۔ وہاں کے حالات اور ہمارے ملک کے حالات میں بہت فرق ہے۔ ان کے ہیرو ان کے آئیڈیل بہت طاقتور تھے تو ہمارے ادیب کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے اس پاکستان کے ہیرو کو تلاش کرے۔ اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ سندھی کا کہنا ہے کہ اگر آپ کوئی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو آپ اپنے لوگوں کو اپنی زمین کی باتیں بتائیں۔

سوال:۔ کیا تحریک آزادی کے ایسے لیڈر جو بعد میں بھارت کے شہری رہے ہمارے ہیرو نہیں ہو سکتے؟

جواب:۔ بھئی ہم تو تاریخ و ادب کی باتیں کر رہے تھے۔ آپ کہاں کارزار سیاست میں آ گئے اور وہ بھی آج کی سیاست جس کی تعریف کسی معروف و مستند کتاب سیاست میں نہیں۔

آپ نے ہندوستانی مسلم رہنماؤں کا ذکر چھیڑا ہے جنہوں نے آزادی کے بعد وہاں سکونت اختیار کی۔ ان کی خدمات ہماری قومی تاریخ کا اہم باب رہے اور ان کے جذبہ ملی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ رہنما جنہوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد نقل مکانی کی وہ کہاں تک درست تھی یہ آپ بخوبی جانتے ہیں اور بہت سے دانشوروں، اور وطن دوست رہنماؤں نے بھی اسے غلط اور ملی مفاد کے منافی اقدام قرار دیا ہے۔ قائد اعظم نے بھی ان رہنماؤں کو ہندوستان میں رہنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی اچھی طرح نگہداشت ہو سکے اور ہمارے دینی اور ثقافتی ورثے کی بھی نگرانی ہو۔ اس ضمن میں آجکل زور و شور سے جو موشگافیاں اور تاویلات کی جاتی رہی ہیں وہ نہ صرف فریب ہے بلکہ

تاریخ کے ساتھ بد دیانتی بھی ہے۔ اگر بفرضِ محال پاکستان کا مطالبہ اسلامی تہذیب تمدن کے تحفظ اور اسلامی تعلیمات اور روایات کے احیا اور فروغ کی آرزو کا رہین منت تھا تو اس سلسلے میں ہم نے گزشتہ چالیس برسوں میں کیا کارنامے سر انجام دیئے ہیں جو نئی نسل کو بتائے جائیں۔ یقیناً ہمارا قرطاسِ کردار بری طرح داغدار ہے۔ کیا برطانوی ہندوستان میں اسلام کی پسپائی ہو رہی تھی یا پاکستان میں اسلام کے ساتھ بھونڈا مذاق کیا جا رہا ہے۔ آخر اس کا کیا پیمانہ ہے، کیا کسوٹی ہے مسلمان کا فرض ہے کلمۃ اللہ کو بلند کرنا اور شعائر اسلام کا تحفظ کرنا۔ ہندوستان سے لاکھوں مسلمانوں کی نقلِ مکانی کی وجہ سے ایک طرف تو ان مقاصد کو بھاری نقصان پہنچا اور دوسری طرف نوزائیدہ مملکت پاکستان کو مستحکم ہونے سے پہلے ہی مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدائی دور میں ہی مواخات اور ملاپ کی فضا پیدا کرنے کے بجائے ایسے حربے استعمال کئے گئے جن کی وجہ سے انصار کا تو استحصال اور استیصال ہوتا رہا لیکن وہ جو راہِ وفا میں برباد ہوئے ان کو مجبور و بے بس اور نفسیاتی طور پر مفلوج مہاجر بنا دیا گیا۔ یہ کارنامے ان ہی حضرات کے قول و کردار کا کرشمہ تھا جو اسلام کی حفاظت اور سربلندی کے لئے صدیوں کا ورثہ دشمنوں کے حوالے کر کے یہاں آئے۔ قیامِ پاکستان کی اسکیم میں اتنے بڑے پیمانے پر نقلِ مکانی اور آبادی کا مسلسل انتقال شامل نہیں تھا۔ از انسوا پاکستان کوئی مفتوحہ علاقہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی یہ کوئی اُجاڑ اور انسانی آبادی سے محروم سرزمین تھی۔

اسی طرح ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا پاکستان کے وفاق میں شامل علاقوں کے لوگوں نے تحریکِ آزادی میں بھرپور کردار ادا نہیں کیا تھا؟ فی الحال تو یہی تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے نئی نسل کو جو چیزیں بتائی جا رہی ہیں اس سے یہی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ دورِ غلامی میں جو جذبہ پیدا ہوا تھا اب وہ عنقا ہے اور جو

لٹریچر پیش کیا گیا تھا اس کی گرفت سے ہمارے ادیب کو باہر نکلنا چاہئے اور آنے والے دور کی فکر کرنی چاہئے۔ جس انداز سے آجکل تاریخ دوبارہ لکھی جا رہی ہے اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ سامراجی نظام میں ہمارے دانشوروں نے جو کچھ لکھا اس میں بدرم سلطان بود کے ماضی پرستانہ اسلوب اور مستقبل کو نظر انداز کرنے کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یا پھر یہ حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر رقم کیا گیا تھا۔ اس کی اچھی طرح چھان بین ہونی چاہئے۔

ٹی وی پر ایک سیریل چلا تھا جس میں تمام غزل گو شعرا کے حالاتِ زندگی اور منتخب کلام پیش کیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں مجھے اپنے تجزیہ کر کے بتانا پڑا کہ یہ سارے بھارت میں دفن ہیں۔ آزادی کی فلم دکھائی جاتی ہے تو اس میں سارے ہندوستانی ہیرو دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں کراچی سے کے ٹو تک کا کوئی آدمی شامل نہیں۔ جو چیزیں اتحادِ ملت میں مدد دیتی ہیں ان کو مکمل، مؤثر اور بہتر انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے معاشرتی زوال سے بہت کم لوگ اُبھرے ہیں اسی لئے مشترکہ باتوں اور قدروں کو فروغ دینا چاہئے۔

بہر حال تینتیس (۳۳) برسوں کے واقعات، جو تاریخِ پاکستان کا واضح متن ہے، بتاتے ہیں کہ پاکستان کے قدیم باشندوں کے ساتھ بڑی بے انصافیاں، زیادتیاں اور ظلم ہوئے جن کو اسلام کے نام پر ابتدائی دور میں تو انہوں نے برداشت کیا لیکن مسلسل محرومیوں اور نظر انداز کئے جانے کے اقدام کا ردِعمل شروع ہوا جو اب عمومی بدامنی، باہمی بے اعتمادی اور زہر ہلاہل کی مانند نفرتوں کا روپ لئے ہوئے، ملک و ملت کی رسوائی اور ذلت کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہمیں جلد بازی سے نہیں البتہ بہت جلد ہی اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ عدل و احسان کے اصولوں پر اور قولِ رسول ؐ کے مطابق کہ "الخلق عیال اللہ" شرعِ محمدی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ "کس نہ باشد

محتاجِ کس"۔

سوال :۔ مالی مشکلات کی بھی شکایت کی جاتی ہے ، کیا واقعی یہ تخلیق کو کسی طور متاثر کرتی ہیں ؟

جواب :۔ اس معاملے میں سندھی ادیب نہایت ہی مظلوم ہے۔ ایک تو اس کی زبان کا علاقہ محدود ہے ، اس کے زبان کے ذرائع ابلاغ محدود ہیں ریڈیو، ٹی وی پر وقت کی شکایت ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ سندھی ادیب پر ان ذرائع ابلاغ کے بڑے احسانات بھی ہیں کیونکہ پیشہ ورانہ تحریروں کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔ سندھی ڈرامے نے خاص طور پر ترقی کی ہے۔ سندھی کے رسائل بہت کم ہیں۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، سندھی ادبی بورڈ، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی کے رسائل شائع ہوتے ہیں لیکن لکھنے والوں کو معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ وفاقی وزارت اطلاعات کے ماہنامہ 'نئیں زندگی' اور سندھ اطلاعات کے جرائد 'پیغام' اور 'اظہار' کی جانب سے معمولی معاوضہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے مالی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے تخلیق اور تحقیق کا معیار محدود ہوتا جا رہا ہے۔

سوال :۔ اگر مالی تحفظ مل جائے ؟

جواب :۔ ادبی سرگرمیاں بڑھیں گی، مالی تحفظ ویسے بھی اعتماد کا سبب بنتا ہے۔ سندھی ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت درسگاہوں اور سرکاری محکموں میں ملازم ہے۔ ایسی بات اردو میں آپ کو کم نظر آئے گی، اردو کے بہت سے شاعر صرف شاعر ہیں۔ اگر انہوں نے کوئی ملازمت کی تو ان کے مزاج کے مطابق ہوگی یعنی قوت گزر سندھی شاعر کا اس کی شاعری نہیں جیسا کہ دوسری زبانوں کے

شعرا کا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے شعرا کی اکثریت۔

سوال :۔ اہلِ قلم نے اب تک معاشرے کو بنانے میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا اس میں کیا مجبوریاں حائل تھیں ؟

جواب :۔ میرا خیال ہے کئی اسباب تھے، جن میں معاشی سبب بھی تھا، پھر کوئی آئیڈیل سامنے نہیں تھا۔

سوال :۔ آئیڈیل تو اب بھی نہیں ہے ؟

جواب :۔ ہمارے ادیب کو چاہیئے کہ اپنی ہی زمین سے اپنی زمین کی تاریخ سے کوئی آئیڈیل تلاش کرے، آئیڈیل بنائے۔

سوال :۔ ابھی اتنا وقت ہے ؟

جواب :۔ قومی لحاظ سے اب بھی وقت ہے۔ ترکی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، ایران کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اصل میں ہمیں فکری یکجہتی کی ضرورت ہے۔ ہماری فکر میں انتشار نہیں ہوگا تو جو مسائل انتشار کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں وہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

سوال :۔ آپ کن چیزوں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں ؟

جواب :۔ میرے لکھنے کی ایک ہی Approach ہے کہ میرا پڑھنے والا یہ سوچے کہ ہم کون ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ایک انسان ایک پاکستانی ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں کچھ کام کرنا ہے اور وہ ہے امن آشتی کا قیام۔ تاکہ شر ختم ہو، انسان آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کرے اور اپنے حوالے کیا ہوا فرض پورا کرے جو اس کی تخلیق کا مقصد تھا۔

سوال :۔ آجکل آپ کیا لکھ رہے ہیں ؟

جواب :۔ ان قومی تحریکات پر کام کر رہا ہوں جن میں صوبہ سندھ کے لوگوں نے بھی حصہ لیا تھا لیکن جو تاریخ لکھی جا رہی ہے اس میں ان کا تذکرہ نہیں، مولانا محمد علی لاڑکانہ گئے۔ ان برادران کے رفقا پر بغاوت کا مقدمہ کراچی میں چلا، اس میں سندھ کے کتنے لوگ شریک تھے اس کا کسی تاریخی کتاب میں ذکر نہیں۔ میمن مسجد میں انہوں نے کیا تقریر کی، بی اماں والی نظم کس نے لکھی اس پر تو بحث ہو رہی ہے لیکن گائی کس نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گاڑی کھاتے کے میمنوں نے گائی۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور آج تک 'جیلی' کہلاتے ہیں، کیونکہ وہ گانے کی پاداش میں جیل گئے تھے۔ بی اماں کو زبردست استقبالیہ دیا گیا اس کا کوئی ذکر نہیں یہ تو صرف ایک مثال ہے۔

سوال :۔ آپ نے آج تک جو لکھا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ پر جو فرض عائد تھا اسے آپ نے صحیح طور ادا کیا ؟

جواب :۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے اس پر پشیمان نہیں ہوں۔ میں نے جو اپنا ادبی نظریہ بنایا ہے اس کے مطابق لکھا۔ میں نے جو بھی حقائق لکھے اس خیال سے لکھے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب ان سب کو ترتیب دے کر کتاب کا روپ دیا جائے گا۔ میں نے جو مضامین لکھے ہیں اور جو موضوعات میرے ذہن میں ہیں مجھے معلوم ہے کہ وہ میری کتابوں کے کس کس باب میں شامل ہوں گے۔ یہ مستقل اور افادی نوعیت کا ادب ہے۔ زندہ رہے گا۔ بقول ممتاز حسن "جب میں اس دھرتی پر گھومتا ہوں تو مجھے بہت خوف ہوتا ہے

اور میں بہت محتاط ہو کر گھومتا ہوں تاکہ میرے پاؤں ان تقدس مآب اصحاب کے پاؤں پر نہ پڑ جائیں جنہوں نے سندھ کو اپنا مسکن بنایا تھا۔" اچھائی انسان کی معراج ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کو آگے بڑھانا چاہئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ "اے قریش! ہماری آپس میں جو مشترکہ باتیں ہیں ان کو اپنائیں۔" کیا یہ ہمارے لئے بھی اچھا نہ ہوگا۔ رسولِ رحمتؐ اور پیغمبرِ وحدتؐ کا یہی پیغام آج بھی ہمارے لئے رہنمائی و ہدایت کا بہترین نمونہ ہے۔ اسلام امن و آشتی کا ہی نام ہے۔

(غیر مطبوعہ انٹرویو۔ ۱۹۸۰ء)

ایک قاری کی سرگزشت

اگست ۱۹۴۷ میں آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے بعض مخلص اور قومی جذبے سے سرشار ناشروں اور کتب فروشوں سے ملنے کا موقع ملا ۔ یہ تعلق آج بھی دوستی اور برادرانہ روابط کے طور پر قائم ہے ۔ چنانچہ آج کے اجتماع میں شریک ہو کر مجھے بہت مسرت محسوس ہوئی ہے ۔ میں گذشتہ چار عشروں سے ادبی خدمت کرتا رہا ہوں جو ایسی وقیع اور موقر تو نہیں کہ اسکا اعادہ کیا جائے البتہ اس عرصے میں ناشر اور کتب فروش دوستوں کے مجھ پر بے حساب عنایات اور کرم نوازیاں ہوئیں جنہیں میں بھول نہیں سکتا ۔ مثل مشہور ہے کہ 'حساب دوستاں دردل' چنانچہ میں چاہوں بھی تو ان مہربانیوں کا کما حقہ' ذکر نہ کرسکوں گا ۔

ناشر حضرات کے کام کی نوعیت میرے فرائض سے مختلف ہے البتہ ایک قدر مشترک یہ ہے کہ وہ اور میں ابلاغ کی مقدس خدمت پر مامور ہیں ۔ اس ضمن میں میری طرف سے کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ ہم خود احتسابی سے کام لیں اور عربی کے ایک مقولے پر عمل کریں 'اَوَلَمْ تَتَفَکَّرُوْ فِیْ اَنْفُسِکُمْ' (کیا آپ نے کبھی اپنے نفس پر بھی غور کیا ہے) یقین جانیے کہ میں اس خود احتسابی کے عمل کی وجہ سے اکثر دکھی رہتا ہوں کیونکہ میں وہ سب کچھ نہیں کرسکتا جو حق و صداقت پر مبنی ہو اور اسلام کے حوالے سے پاکستانی معاشرے کی ضروریات کے مطابق ہو ۔

میں نے مختلف شہروں میں کتابوں کی نمائشیں یا نمائشوں میں کتابوں کی اسٹالیں دیکھی ہیں ۔ ۱۹۴۹ء میں قائد اعظم کے مزار سے ملحق ایک بین الاقوامی نمائش منعقد ہوئی تھی جس میں کتابوں کی چند اسٹالیں بھی تھیں ۔ اس دور کی کافی کتابیں میرے پاس اب بھی موجود ہیں ۔ جب میں ان کا موجودہ دور کی کتابوں سے موازنہ کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ نت نئی دریافتوں کے باوجود کتابوں کا معیار کیوں کم ہوتا جا رہا ہے ۔ طباعت کے سلسلے میں تو ہم نے کافی ترقی کی ہے لیکن مواد کے معاملے میں تہی دامنی کی شکایت میری طرح اور بہت سے حضرات بھی کریں گے ۔

بہرحال مجھے تو یہ فرمایا گیا ہے کہ میں کتابوں کی مقبولیت میں ذرائع ابلاغ کے کردار پر کچھ کہوں ۔ یہ موضوع دیکھا جائے تو میرے لئے اجنبی نہیں تو غیر متعلق ضرور ہے ۔ کیونکہ مجھ سے تو یہ کہا جانا چاہیئے تھا کہ سرکاری مطبوعات کو قبول عام حاصل کیوں نہیں ہوتا یا یہ کہ سرکاری مطبوعات اور جرائد کیوں پڑھے نہیں جاتے ۔ اس موضوع پر شاید میں آپ سے چند باتیں کرنے کی جسارت کرتا کیونکہ دس برس تک میں سندھی ماہنامہ 'پیغام' اور اردو ماہنامہ 'پیغام' اور 'اظہار' کی ادارت اور اشاعت سے منسلک رہا ہوں ۔ اسی دوران میں کچھ اور مطبوعات بھی میں نے مرتب کر کے شائع کی تھیں ۔

تو موضوع ہے 'کتابوں کی مقبولیت میں ذرائع ابلاغ کا کردار' ۔ یہاں مقبولیت سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ کتب بینی کے شوق و ذوق کا فروغ ۔ بہرحال یہ ایسا موضوع ہے جس پر اخباروں اور جرائد سے متعلق حضرات یا اشاعتی اداروں کے سربراہ ہی کچھ کہہ سکتے ہیں ۔ اس موضوع پر میرا کچھ کہنا خود میرے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے کیونکہ غیر معیاری کتب اور جرائد کی انجمن ستائش باہمی کے مروج روش کے

تحت چلبشی نہ صرف نوخیز ذہنوں کے لئے مضر ہے بلکہ وقت اور پیسے کے ضیاع کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے مجھے دکھ ضرور ہے کہ معدودے چند ذرائع ابلاغ کے علاوہ اچھی کتابوں کی مناسب پبلسٹی نہیں ہوتی۔ اس صورتِ حال کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے اہم سبب یہ ہے کہ اکثر ذرائع ابلاغ میں ایسے حضرات کا فقدان ہے جو علم و ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں، مطالعے کا ان کو شوق ہو اور پھر کسی ثابت رائے کے اظہار کی جرأت بھی کرتے ہوں میں نے دیکھا ہے کہ مصنفین یا ناشرین کی طرف سے لکھے ہوئے تبصرے شائع کئے جاتے ہیں یا انگریزی اخباروں اور جرائد میں بیرونی اشاعتی اداروں کی طرف سے مہیا کیا گیا سنڈیکیٹیڈ مواد شائع کیا جاتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اچھی کتابوں کی تصنیف اور اشاعت کی طرف کم توجہ دی جا رہی ہے۔ ہم لسانی جھگڑوں اور بیرونی ثقافتی یلغار کی زد میں آ گئے ہیں مغربیت اور جدیدیت کی الجھن نے ہمیں فکری جمود کا شکار بنا لیا ہے جس سے ہمارا ادب بھی بُری طرح متاثر ہوا ہے حالانکہ یہ سیدھی سادی بات ہے کہ مغربیت ایک تمدن ہے جس میں مادیت اور تجارتی ذہنیت اور اس کے نتائج کا بھرپور پرتو نظر آتا ہے اور جدیدیت ایک فکری دھارا ہے جو تاریخ کا تقاضہ ہے، زمانے کے تغیر کی تفسیر ہے اور ترقی و تعمیر کے لئے اکسیر ہے۔ جدیدیت، ماضی کا انکار نہیں بلکہ اس کی عصرِ حاضرہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق تجدید ہے کیونکہ ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی رو ہے۔ آج کو کل، کل کہا جائے گا۔ ہمیں ادب کے ذریعے اس نکتہ کو زردار کرنا ہے تاکہ ہم من حیث القوم عالم آفاق (خارجی کائنات)

اور عالم انفس (انسانی دنیا) سے بیک وقت کما حقہٗ آگاہ ہو سکیں۔ کیونکہ جب تک ہم نے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کی تو باہر کی تبدیلیاں اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

تیسرا سبب کتابوں اور جرائد کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں جو علم کے فروغ میں بُری طرح مانع ہوتی ہیں۔ آجکل ہر انسان معاشی تنگ و دو میں بُری طرح ملوث ہے اور آسائش کا طلب گار ہے۔ ناشرین بھی انسان ہیں، انہیں بھی اپنی اور اپنے لواحقین کی ضروریات اور آرام کا خیال کرنا ہوتا ہے اگر یہ حضرات مصنفین اور قارئین کا بھی اسی طرح خیال کرتے اور ساتھ ساتھ علم و ادب کے ابلاغ کو اپنے فرائض میں شامل سمجھتے تو کتابوں کی گرانی کا مسئلہ کافی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔

معروف ذرائع ابلاغ کے علاوہ کتب بینی کے شوق و ذوق اور مقبولیت کے فروغ کا ایک قدیم ذریعہ گشتی کتب خانے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ غالب کرایہ کے مکان میں رہتے تھے اور کرایہ کی کتابیں مطالعہ کرتے تھے۔ وہ دور یقیناً آداب اور اقدار کے اعتبار سے، موجودہ مادیت پرست اور خودغرضانہ معاشرے کے مقابلے میں بہتر ہوگا کیونکہ آجکل کرایہ پر کوئی چیز دینے کا مطلب اس چیز کی ملکیت ہی سے محروم ہو جانا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد چھٹے عشرے میں روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور نے 'مکتبہ نوائے وقت' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع کیں جن میں دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ہفت روزہ 'ریاست' دہلی کے تجربوں، مشاہدوں اور تاثرات پر مشتمل ایک سبق آموز

اور عبرت آمیز آپ بیتی بعنوان 'ناقابلِ فراموش'، علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ 'باقیاتِ اقبال'، عبدالکریم ثمر کی نظموں کا مرقع 'لوح و قلم'، ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے کلام کا مجموعہ 'آتش کدہ'، مشہور شاعروں کی بچوں کے لئے نظمیں 'پھول ہی پھول'، سید امتیاز علی تاج کا شہرۂ آفاق تاریخی ڈرامہ 'انارکلی'، ماہرِ دست شناس میر بشیر کی کتاب 'دست شناسی اور بینکاری'، انکم ٹیکس اور کرکٹ سے متعلق کتابوں کے علاوہ افسانوں اور بچوں کی کہانیوں کے مجموعے اور شیر محمد اختر کی کتاب 'کمال و زوال' اور تقسیم ملک کے واقعات پر ناولٹ کی صورت میں 'اس صدی کی کہانی' کے عنوان سے کتابیں شامل ہیں۔

اس طرح 'جنگ' کراچی نے محترم رئیس امروہوی کے قطعات پر مشتمل دو خوبصورت مجموعے ساتویں عشرے میں شائع کئے۔ حال ہی میں 'جنگ' لاہور نے سفرنامے، طنز و مزاح اور حالاتِ حاضرہ پر عمدہ کتابیں شائع کی ہیں مثلاً جناب محمد اصغر خان کی انگریزی کتاب 'The lighter side of the power game'، جناب حنیف رامے کی کتاب 'پنجاب کا مقدمہ'، مخدوم زادہ سید حسن محمود کی یادداشتیں 'میرا سیاسی سفر'، محترمہ بلقیس ظفر کا سفرنامہ 'مسافتیں کیسی'۔ محترمہ پروین عاطف کا سفرنامہ 'کرن تتلی اور بگولے'، ڈاکٹر صفدر محمود کی طنز و مزاح سے بھرپور کتاب 'سدا بہار' اور جناب کوثر نیازی کی کتاب 'اور لائن کٹ گئی'۔ ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی نے بھی اس ضمن میں قدم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے کو فروغ دینا چاہئے کیونکہ اس طرح کتاب کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہوگا اور نئے ادب اور مسائلِ حاضرہ سے آگاہی ہو سکے گی۔

آپ نے اکثر فنکاروں اور گلوکاروں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ انہیں بچپن ہی سے یہ شوق تھا۔ کہنے میں کیا ہے، میں بھی عرض کرتا ہوں کہ بچپن سے تو مجھے قرآن کریم پڑھنے کا شوق اور صوم و صلوٰۃ کا ذوق تھا۔ پرائمری میں آنے کے بعد پہلی جماعت ہی میں، میں نے ساتویں جماعت کی ادبی اور تاریخی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ چوتھی جماعت میں، میں نے قصہ چہار درویش، الف لیلیٰ، گل بکاؤلی، فسانہ عجائب عرف گلِ خنداں، داستان امیر حمزہ اور بہت سی ناولیں سرسوں کے تیل کے چراغ کی روشنی میں اپنے گھر والوں اور رشتے داروں کو سنائیں۔ یہ کتابیں اُردو سے سندھی میں ترجمہ ہوئی تھیں جس کی وجہ سے یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی ایسا موقع ملے کہ اُردو میں ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ انگریزی چوتھی کلاس میں، جس کو اب ساتویں جماعت کہا جاتا ہے میرا یہ شوق بھی پورا ہوا کیونکہ ہمارے گاؤں کے زمیندار آغا بدرالدین درانی کے یہاں کافی تعداد میں اردو اخبار و جرائد آتے تھے اور کتابوں کا وافر ذخیرہ ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔ یہ شوق و ذوق گورنمنٹ ہائی اسکول، شکارپور میں بھی جاری رہا گو کہ وہاں ہاسٹل میں بجلی نہیں ہوا کرتی تھی۔

کراچی میں آنے کے بعد مجھے مطالعے کی بہت آسانیاں میسر ہوئیں اور میں اُردو ہفت روزہ 'ہمدم' کے معروف مدیر اور دانشور جناب جالب دہلوی کی طرح فٹ پاتھوں سے استفادہ کرتا رہا اور یقین جانیے کہ اس دور میں مجھے بہت اچھی اچھی کتابیں دستیاب ہوئیں جو اب بھی میرے لئے قابلِ فخر اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن تمدنی ماحول کو کثافت سے پاک کرنے کی کوشش میں وہ علم کے

خزانے کراچی کے فٹ پاتھوں سے غائب ہوگئے اور ان کی جگہ پر اشیائے بیجا صرف نے لے لی اور یوں ثقافت کی جگہ پھر بھی کثافت ہی نے لے لی۔ یہ گزرا ہوا زمانہ اب بھی مجھے بہت یاد آتا ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جب کبھی میں نے ڈاک کے ذریعے کتابیں منگوائیں تو اکثر اس تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑا کہ ناقص کتابیں وصول ہوئیں جو یا تو ان میں سے جُزیں غائب ہوتیں یا پھر بائنڈنگ کے دل آزار نقائص۔ ایسا تلخ تجربہ اکثر 'نقوش' کے ضخیم اور مختلف نوعیت کے شماروں کے سلسلے میں ہوا۔ ایسے تجربوں کے بعد میں نہ تو ڈاک کے ذریعے کتابیں منگواتا ہوں اور نہ ہی تبصرے یا اشتہار پڑھ کر۔ یوں بھی جو چیز خریدی جائے اس کی اہمیت اور افادیت کا پہلے سے تھوڑا بہت تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ بہرحال اب طباعت کی جدید سہولتیں مہیا ہونے کے بعد ناشرین کو ان امور پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ کتاب دوست اور ساتھی کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس دوستی میں طباعت کے نقائص رخنہ نہ ڈالیں اور نہ ہی قاری کا دل مطالعے کے شوق سے اکتا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ کتابوں کی طباعت، اشاعت، تقسیم اور فروخت سے متعلق مسائل پر بھی اس نمائش کے دوران منعقدہ مذاکروں میں کارآمد بحث ہوئی ہوگی لیکن میں آپ کی خدمت میں ایک گزارش پیش کر رہا ہوں جو حکایت بھی ہے اور شکایت بھی۔ میں نے اس نمائش کے اسٹالوں کی سیر کی لیکن مجھے سندھالاجی کے اسٹال کے علاوہ کہیں بھی سندھی کتاب نظر نہیں آئی، حالانکہ کراچی عروس البلاد اور بین الاقوامی شہر کے ساتھ ساتھ سندھ کا دارالحکومت بھی ہے۔

میرے خیال میں آپ حضرات اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ برطانوی ہندوستان میں سندھ میں لکھی گئی اکثر کتابیں جن میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر، شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالہ، شاہ کریم کا رسالہ اور بہت سی دوسری دینی، اخلاقی اور ادبی کتابیں نول کشور پریس، لکھنؤ، مطبع کریمی، بمبئی اور امرتسر اور لاہور کے مطابع میں چھپتی تھیں اور ان شہروں میں دستیاب بھی ہوتی تھیں۔ آزادی کے بعد چالیس برسوں کے عرصے میں کراچی سے سندھ کے متعلق بہت ہی کم تعداد میں کتابیں شائع ہوئیں۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز، نفیس اکادمی، انڈس پبلیکیشنز آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، اکرم سنس، اردو اکادمی سندھ، عباسی بک ڈپو، مکتبہ اسحاقیہ اور رائل بک کمپنی نے کچھ نئی پرانی کتابیں شائع کی ہیں۔ شیخ غلام علی نے قرآن مجید کے سندھی ترجمے، شاہ لطیف کا رسالہ اور مشہور ضخیم سندھی ناول 'سانگھڑ' شائع کیا۔ اگر ناشر حضرات اپنے سالانہ بجٹ میں سے محض ۵۰ ہزار روپے سندھی کتابوں کی اشاعت کے لئے مختص کریں تو ایک طرف سندھی ادب کو فروغ حاصل ہوگا اور دوسری طرف باہمی اتحاد و الفت اور قومی یکجہتی کے جذبات پروان چڑھیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ کتب فروش حضرات کو بھی چاہیئے کہ وہ اردو کتابوں کے ساتھ جب انگریزی کتابیں رکھ سکتے ہیں تو سندھی کتابیں رکھنے اور فروخت کرنے میں کیا حرج ہے۔ مانا کہ سندھی کتابیں کم بکتی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کا سبب بھی یہی ہے کہ سندھی کتابیں عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں۔

'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ اسلام میں جس بزرگ نے تصنیف کی ابتدا کی وہ امام ربیع بن صبیح سندھی ہیں

جس نے ۱۶۰ ہجری میں وفات پائی۔ امام ربیع کے بعد امام سفیان بن عیینہ نے کتاب لکھی اور بعد میں امام مالک بن انس نے مدینے میں "موطا" تصنیف کیا۔ پھر تو مصر، یمن، کوفہ، بصرہ اور خراسان میں تحقیق و تصنیف شروع ہوئی۔ حدیث کے صحاح ستہ اور دوسری بہت سی کتابیں بعد میں وجود میں آئیں۔ لیکن جب قندھار یا دہلی سے سندھ پر جارحانہ حملے شروع ہوئے تو بے انتہا جانی و مالی نقصان کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی ذخیرے بھی تباہ ہوتے رہے اور بہت سے سندھی علما نقلِ مکانی کر کے پردیس چلے گئے اور یوں سندھ کی بیش بہا کتابیں گجرات، برہان پور، لکھنؤ، عربستان، شام، لبنان، عراق اور یمن میں محفوظ ہو گئیں جن میں سے بعض شائع ہو چکی ہیں اور کافی تعداد میں مسودوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں علامہ ابوالطیب سندھی کی "شرح سنن ترمذی" ڈیمی سائز کے ۱۴۰۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح علامہ محمد عابد انصاری سیوھانی کی صحیح بخاری سے متعلق ضخیم کتاب اور ان ہی بزرگ کی ۲۸ جلدوں پر مشتمل "شرح الدر المختار" جو مدینہ منورہ کے شیخ مولانا مظہر کے کتب خانہ میں قلمی صورت میں موجود ہے، دینی ادب کا بیش بہا اثاثہ ہیں۔

دیدم سلطان بود میرا شعار نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے عرب دانشوروں نے سندھ کی علمی فضیلت کا اعتراف کیا ہے۔ "اخبار الحکماء" میں بیان کیا گیا ہے کہ "تمام قوموں میں سندھ علم و حکمت کا سرچشمہ ہے اور اقوامِ عالم میں عدل و سیاست کا پہلا مرکز ہے۔ ہمارے ملک سے دور ہونے کی وجہ سے سندھ کی کتابیں ہمارے علما تک کم تعداد میں پہنچی ہیں، تاہم، ہم تک جو کچھ

پہنچا ہے وہ نہایت قلیل حصہ ہے۔"

میں یہ بھی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ صوبہ سندھ میں علمی کتب خانوں کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن اگر ایک مربوط منصوبے کے تحت عربی اور فارسی کلاسیکی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کرے تو اندرونِ ملک مغربی ممالک اور عالمِ اسلام میں ان کے لئے منافع بخش مارکیٹ مہیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سندھ کے عالموں کی تصانیف کے مسودات کثیر تعداد میں اسلامی دنیا کے مشہور و معروف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور تحقیق و تالیف کے ضمن میں ان سے بہت سے دانشور اور محقق استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے ان بے ربط اور منتشر خیالات سے اکتا نہیں گئے ہوں گے۔ علم و ادب کی باتیں کرنے اور سننے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ ہم محبِ وطن ہیں اور چاہتے ہیں کہ ادب کے ذریعے صحیح سمت میں معاشرے کی تشکیل ہو اور صحتمند کردار سازی کو فروغ حاصل ہو۔ انشاء اللہ کبھی موقع ملا تو تفصیلی گفتگو ہو گی، فی الحال میرے دوسرے دوستوں کی فکر انگیز، کارآمد اور مفید باتوں سے آج کے مذاکرے کے اہتمام کا مقصد کافی حد تک پورا ہو جائیگا۔

(۱۵ جنوری ۱۹۸۸ کو پاکستان پبلشرز و بک سیلرز ایسوسی ایشن کی طرف سے تیسرے قومی کتاب میلے کے موقع پر منعقدہ مذاکرے میں پڑھا گیا۔)

ذکرِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم

(سندھی نعتیہ دیوان)

آنحضرت نبی کریم محمد مصطفےٰ کی سیرت مبارک پر آج تک نظم و نثر میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے اتنا کسی اور نبی یا دوسرے بطلِ جلیل کے بارے میں تحریری سرمایہ نہیں ملتا۔ اس کا ایک واضح سبب یہ ہے کہ رسول اللہ کی زندگی کا ہر لمحہ، آپ کے اہلِ خانہ، ساتھیوں اور پیروکاروں کے نہ صرف سامنے رہا بلکہ یہ آپ کا ارشادِ گرامی تھا کہ آپ کے قول و عمل کو ان لوگوں تک من و عن پہنچایا جائے، جنہیں آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں آپ کو متحرک قرآن بھی کہا گیا ہے کیونکہ باری تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی کے ذریعے جو کچھ نازل ہوا، وہی آپ کا عمل اور کردار رہا۔

قرآن حکیم نے حضور سرورِ عالم کو آخری رسول اور نبی بتایا ہے اور یہ کہ آپ دنیا کے لئے روشنی کا مینار ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ ایسے رسول ہیں جو لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت فرماتے ہیں۔ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کو شرک اور گناہ کی گندگی سے پاک اور صاف کرتے ہیں۔

خداوندِ قدوس کے جتنے احسان اولادِ آدم پر ہیں ان میں سب سے بڑا احسان ظہورِ محمدی ہے۔ یہ احسان ساری کائنات پر ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔ رسولِ کریمؐ سے ہی تو ہم نے دینِ فطرت سیکھا۔ قرآن جیسے عطائے الٰہی سے نوازے گئے

نیکی اور بدی میں فرق کو جانا اور ہم نے دنیا میں حق و صداقت، امانت و عدالت کی جو شمع روشن کی وہ بھی آپؐ کی ہی عنایت اور کرم نوازی ہے۔ چنانچہ ایسا محسنِ اعظم اور رہبرِ اعلیٰ جو انسانوں کو گمراہی کی ظلمت سے نکال کر سیدھی اور روشن راہ پر لائے اور پروردگارِ عالم سے انسان کا تعلق قائم کرے، وہ یقیناً انتہا درجے کی توقیر و تعظیم اور محبت کا حقدار ہے۔

حضورِ پُرنور کے بارے میں وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ اور لَقَدۡ كَانَ لَـكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ کی آیات نازل فرما کر خود اللہ تعالیٰ نے گویا سب سے پہلی نعت ارشاد فرمائی اور بتایا کہ "بے شک اللہ اور اس کے فرشتے اس نبی پر رحمت بھیجتے ہیں" اور حکم دیا کہ "اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔" (الاحزاب - ۵۶) چنانچہ رسولِ کریم کی توصیف اور تعریف میں کائنات کی ہر چیز رطب اللسان ہے کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں اور ہر مسلمان کی شناخت کا یہی استعارا ہے۔ آپ ہمارے لئے نیرِ مصدقہ، انسانِ کامل اور بے نظیر قابلِ تقلید مثال ہیں۔

نبی اکرمؐ کی مدح و ثنا کو نعت کہتے ہیں کیونکہ اس صنفِ سخن میں اچھائیوں کو بیان کیا جاتا ہے اور قبیح میں اس کا استعمال نہیں۔ (ابن اثیر ج ۵، صفحہ ۶۷) صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصدِ نبوت سے وابستگی پائی جائے، جس میں جنابِ رسالتمآبؐ سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ نثر ہو یا شعر، نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو

یا مثنوی، رباعی ہو مثلث، مخمس یا مسدس، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دارومدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے۔ اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دوجہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور موجودات کے لئے ہے اسے نمایاں کرنا ہو تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے۔ (ممتاز حسن: خیر البشر کے حضور میں، صد ۳ م)

سندھی زبان کی اساسی شاعری میں دینی رنگ غالب نظر آتا ہے اور الف اشباع کی طرز پر بہت سی نظمیں آنحضرت کی سیرت، شمائل اور غزوات کے بارے میں ملتی ہیں۔ اس کے بعد مدح، مناجات، مولود اور سی حرفی کے ضمن میں بھی سندھی شاعروں نے نبی اکرم کی بابرکت ذاتِ اقدس کے مختلف پہلوؤں کو منظوم کیا ہے۔ البتہ نعت کی صنفِ سخن سندھی شاعری میں ماضی قریب کی چیز ہے۔ لیکن بدلتے ہوئے ادبی مذاق و ماحول کے پیشِ نظر، سندھی شاعروں نے اس میدان میں بھی اپنی سخنوری کے جلوے دکھائے ہیں۔ نظم اور غزل میں، مثنوی اور مسدس میں، بیت اور کافی میں، سانیٹ اور ہائیکو میں، آزاد نظم اور نثری نظم میں انہوں نے عشقِ رسول کا عاجزانہ اظہار کیا ہے۔

جدید سندھی نعتیہ شاعری کے سرمایہ سخن میں مولوی عبداللہ اثر مرحوم کی کتاب "ذکرِ حبیب" اہم حیثیت کی حامل ہے۔ یہ دراصل عربی حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کیا ہوا نعتیہ دیوان ہے جو پندرھویں صدی ہجری مطبوعات کے سلسلے میں شائع کیا گیا ہے۔ سندھی نعتیہ شاعری میں اسے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

جناب اثر مرحوم تحصیل لاڑکانہ کے ایک گاؤں بیٹرو چانڈیہ میں ۴ جولائی ۱۹۲۰ء

کو پیدا ہوئے اور ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ کو ایک جانکاہ حادثے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے عربی، فارسی، سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ آپ نے محکمہ تعلیم میں اہم تدریسی اور ناظرانہ خدمات انجام دیں سندھی کے علاوہ انہوں نے فارسی اور اردو میں بھی شاعری کی۔ بہت سی علمی و ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ان کے کلام میں سندھی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ روایت کی شعوری پابندی کے ساتھ جدت اور انفرادیت حسن و عشق کے ساتھ وطن دوستی، انصاف پسندی اور معاشی و معاشرتی ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ فکر کی گہرائی، لفظی اور معنوی خوبصورتی آپ کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ نعتیہ شاعری سے آپ کو خاص دلی لگاؤ تھا۔ چنانچہ انہوں نے مشہور عربی قصائد کعب بن زہیر کے "قصیدہ بانت سعاد"، شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن زید بوصیری کے "قصیدہ بردہ" اور "قصیدہ غوثیہ" کے منظوم سندھی تراجم کئے۔ زیرِ تبصرہ دیوان میں ان کی ۸۴ نعتیں اور چار مثنویاں شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ایک حمدیہ مثنوی اور ابتدائی حمد بھی مشمول ہیں۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے اپنے مقدمہ میں جناب عبداللہ اثر کی سیرت و کردار اور علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

یہ خوبصورت کتاب الائیڈ پرنٹنگ کارپوریشن گاڑی احاطہ، حیدر آباد میں طبع ہوئی اور اسے محترم انور جوکھیو نے پربھات پبلیکیشنس لاڑکانہ کی طرف سے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ سرورق جناب غلام عباس خاصخیلی کی تخلیق ہے۔ جناب حفیظ کھوہارو نے مسجد نبوی کے پس منظر میں اثر مرحوم کا خوبصورت خاکہ بنایا ہے جو کتاب میں شامل ہے۔ ڈیمی سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل اس "نعتیہ دیوان" کی

قیمت چھ روپے ہے۔

اخترؔ مرحوم کے 'نعتیہ دیوان' میں سیرتِ رسولؐ کے صرف چند ایک موضوعات کو منظوم کیا گیا ہے۔ ظہورِ قدسی کے موضوع پر زیادہ نعتیں ہیں کیونکہ یہ واقعہ ایک سعید مولود کے علاوہ دنیا میں کلمۂ حق و صداقت کے بلند ہونے اور عظیم معاشرتی اور معاشی انقلاب رونما ہونے کی بشارت تھی۔ جناب اخترؔ فرماتے ہیں ؎

مبارک صد مبارک ، بانیِ صد انقلاب آیو
قدم جنھن جے سان ٿي ويو، فيضِ قدرت جا بجا پيدا

آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت کی وجہ سے دنیا نورِ محمدی سے منور ہوئی اور کفر کا اندھیرا چھٹ گیا۔ اسی طرح حق و باطل کا فرق بھی عیاں ہو گیا ؎

منور ٿي ويو عالم ، ٿيو نورِ خدا پيدا
قريشي ، هاشمي ، سيد ، محمد مصطفٰےؐ پيدا

اور فرماتے ہیں ؎

سربسر، سرسبز تو کھاں، ٿي دلين جي سرزمين
بحر و بر ميں ٿو وسيں ، اللہ جا ابرِ عطا

نعت میں جو جدید مضامین اور مسائل بیان کئے جا رہے ہیں، اس ضمن میں اخترؔ نے کہا ہے کہ اہلِ دانش کو چاند تک رسائی نہ ہوتی اگر آپ نے شق القمر کا معجزہ نہ دکھایا ہوتا ؎

ملے ها اہلِ دانش کھے نہ ہرگز چنڊ جو رستو
هی آنگر جو اشارو آه ، رہ ہموار جي رونق

امیرؔ مینائی کے معراج مصطفٰےؐ کے بارے میں چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

کس کے آنے کی فلک پر ہے خبر آج کی رات
آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آج کی رات

کہکشاں کہتی ہے قسمت کا ستارہ چمکا
ہوگا اس راہ سے حضرت کا گزر آج کی رات

حوریں فردوس سے نکلی ہیں نچھاور کرنے
سر پہ رکھے طبقِ لعل و گہر آج کی رات

ان اشعار میں زیادہ تر الفاظ پر زور ہے۔ جناب اخترؔ نے بھی 'مثنوی معراج النبیؐ' میں اس مضمون کو باندھا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت میں مگن ہو کر حوروں نے جنت کا چمن سجایا، شاہِ اممؐ خوش اوقات میں اس طرح روانہ ہوئے جیسے کہ اندھیری رات میں چاند خراماں چلتا ہے اور جس طرح شیشے سے کرنیں (شعاعیں) گزرتی ہیں، اسی طرح حضورِ اکرمؐ آسمانوں میں سے گزرے ؎

ٿي ويون حورون محبت ميں مگن — خوب سينگاريائون جنت جو چمن
ٿيو روانو شاه، خوش اوقات ميں — جئن ٿلے ٿو چنڊ کاری رات ميں
آسمانن مان ويو جئن سيدِ عالی وقار — ٿو وڃے جهڙی طرح شيشن مان کرڻن اُڏار

آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس بے سایہ تھی۔ اس مضمون کو بہت سے ناعتوں نے منظوم کیا ہے۔ فیضیؔ کا ایک شعر ہے ؎

اُمّی و دقیقہ دانِ عالم — بے سایہ و سائبانِ عالم

اخترؔ فرماتے ہیں ؎

ھو اُتي بنرِ ليو، نکته دانِ حيات   ھو بے سايه دنيا جو آسايه دار

نبی کریمؐ کی ایک اہم صفت یہ بھی ہے کہ آپ رسولِ وحدت ہیں۔ آپ نے خاندانی ملکی اور رنگ و نسل کے امتیازات کو مٹا دیا اور انسانی اخوت و مساوات اور سماجی انصاف کا علم بلند کیا۔ اپنے قول و عمل سے اس نئی تہذیب کو پروان چڑھایا ہے

عظمتِ انسان جو ضامن توں آھين ھر طرح

ڀڪيو سنڌءِ ذرّه نوازي سانڻ ذرو آفتاب

اور فرماتے ہیں ؎

ھِت نه کو سنڌي، عرب، افغان، ايراني رھيو

تو کيو زنگِ اخوت سانڻ نفرت جو علاج

حضور ختمی المرتبتؐ کا وصفِ رحمۃ للعالمین اور شانِ کریمی بھی اکثر ناعت کا موضوعِ سخن رہا ہے۔ مثلاً ؎

یارب تو کریمی و رسولؐ تو کریم   صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

اثرؔ مرحوم نے اس نکتہ کو سندھی میں یوں ادا کیا ہے ؎

ھُو کريم آھے بذاتِ خود کريم اُن جو خدا

آ کريمانه روش، عادت رسول الله جي

بيکسن جو ڀَر ڀَلو آھين اُڏين جو آسرو

سائين پڻ ڏکھان آھين توں وڏو مھربان، تو تے سلام

آنحضرت صاحبِ قرآن، فخرِ دو عالم کا سراپا بیان کرتے ہوئے جناب اثرؔ فرماتے ہیں۔

والليل وار جنھنجا، طٰا ميں پار جنھنجا

ظاھر بقدر جنھان ھئي، جنھنجي ملے نشاني

ایک اور پیارا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

اُن جے بِن ڀِھرِ وَن جنھي تبلن کھے آکيا کيو

ذاد يکتائي جو ساماں ھئي ديٺي اُن جي جبين

یہ مضمون بہت کم شاعروں نے باندھا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ اکثر شعرا عشقِ رسولؐ کے اظہار میں حدِ ادب ہی سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ دین کے دائرے سے بھی باہر چلے جاتے ہیں اور خدا اور بندہ کے فرق کا خیال نہیں رکھتے۔ مثلاً آنحضرت کو 'احمد' بلا میم یا 'معرب' بلا 'ع' کہنا یہ صریحاً گستاخی اور بیباک خطاکاری ہے۔ اثرؔ مرحوم بھی اس فاش غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن بعض نعتوں میں، اس نے یہ فرق نہایت خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے اور حقیقتِ محمدیؐ کے ادراک سے بشر کی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے 'مثنوی جلوۂ حقیقت' میں فرماتے ہیں ؎

خلق آئين خالق سان ھُن جو واسطو

سُڀ پيدا ڀئيو ڏسي ھي رابطو

ناه سو خالق، نه خالق کھاں جُدا

ڀيچ در ڀيچ آه، جاڻڻي ھتو خُدا

آسندس ادراک کھاں عاجز بشر

بندگي پنھنجي زبان اھلِ نظر

بہرحال مولوی عبداللہ آثر کا نعتیہ دیوان سندھی شاعری میں ایک اہم علمی تخلیق ہے۔ ان کے چند اشعار پر میں اپنا تبصرہ ختم کرتا ہوں ؎

ہر سعادت تھو رکھے اُن جو وُجود
تھو پڑھے اللہ بھی اُن تے دُرُود
جنہن جے صدقے آجہان ہست و بُود
پڑھجے اُن تے دائما دل سان دُرُود

اور

ہر خطائے دہر تے آ تنہنجی اشاعت محفوظ
تھی ورفعنا لک ذکرک جی ضمانت محفوظ

(بشکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی؛ ۲۴ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ)

—ooo—

سرودِ طیبہ

محمد حسن زبیری جاتی مرحوم کی نعتوں کا مجموعہ 'سرودِ طیبہ' حال ہی میں ان کے بھائی خورشید اعجاز نے محبت اور عقیدت سے، جمیل نقش کے بنائے ہوئے رنگین گرد پوش کے ساتھ نہایت عمدگی سے طبع کروایا ہے۔ یہ مجموعہ حسن بھائی اپنی زندگی میں خود ہی مرتب کر چکے تھے لیکن ان کی حیاتِ مستعار میں زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

حسن بھائی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۳ء میں ہفت روزہ 'جھنکار' کے دفتر میں ہوئی تھی اور بعد میں آرام باغ کے بالمقابل واقع ان کے فلیٹ میں دو چار بار کھانے کی دعوت پر۔ اس وقت حسن بھائی روزنامہ 'خیبر میل' پشاور کے نمائندہ تھے۔ گویا میں انہیں ایک صحافی کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ وہ کم گو، حیادار، مہذب اور سنجیدہ مزاج واقع ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں محبت اور صداقت کی لازوال چمک دیکھنے میں آتی تھی۔ ان مختصر ملاقاتوں اور صحبتوں میں انہی کی زبانی 'مثنوی مارشل لا' کے اقتباسات سننے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اب کے 'سرودِ طیبہ' کی اشاعت سے پہلی بار مجھ پر ان کی ذات کا حسن منکشف ہوا۔ عشقِ محمدیؐ کی روح پرور جھلکیاں دلی سرور کا باعث بنیں اور ذہن میں بے پناہ تلاطم پیدا ہوا۔ حضورِ اکرمؐ سے

ان کی محبت اور شیفتگی کئی نعتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختلف عنوانات مثلاً سفرِ شوق، حضوری، دوری اور مہجوری کے تحت، ان کے اس والہانہ عشق کے جذبات و تاثرات نے مجھے بے تاب کر دیا۔

کفن پہنے ہوئے سوئے حرم جاتے ہیں دیوانے
؎ کہاں پہنچائے گا یہ جذبۂ دیوانگی جانے

؎ خاکِ طیبہ سے ہوئی ہے ابتدا جس عشق کی
ہو طلب صادق تو اس کا منتہا کعبہ میں ہے

پھر رہا ہوں گردِ بیت اللہ یوں پروانہ وار
کیونکہ جامی نقشِ پائے مصطفیٰ کعبہ میں ہے

؎ ہے جس کا روح الامیں درباں، طواف کرتا ہے جس کا کعبہ
خدا کے بعد اور حرم سے آگے، ادب کا ایسا مقام آیا

؎ سر جھکا ہے درِ مصطفیٰ پر مرا دونوں عالم کی دولت مرے ہات ہے
چشم پُرنم ہے لب پر تہلیل ہے دل سے جاری خدا کی مناجات ہے

؎ بسا ہوا ہے نبیؐ کا دیار آنکھوں میں
عیاں ہے رحمتِ پروردگار آنکھوں میں

کچھ ایسی مجھ کو پلائی ہے میرے ساقی نے
کہ آج تک ہے اس کا خمار آنکھوں میں

ہے سیلِ اشکِ رواں اس طرح دمِ رخصت
نہاں ہو جیسے کوئی جوئبار آنکھوں میں

؎ فرقت میں مدینہ والے کی، یوں وقت گزارا کرتے ہیں
دن رات تصور میں پیہم، طیبہ کا نظارا کرتے ہیں

؎ زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لیتا رہا برسوں
لبوں پر ہیں مگر اب تک تری عظمت کے افسانے

؎ جامی نبیؐ کا عشق ہی اصلِ حیات ہے
اُن سے اگر پھروں تو اُٹھا لے خدا مجھے

اس نعتیہ مجموعے میں عددی لحاظ سے ایک حمد اور ۴۳ نعتیں غزل، مخمس اور نظم کی ہیئیت میں شامل ہیں۔ لیکن جذبہ کی سچائی، ذہنی وابستگی اور قلبی تعلق کے اعتبار سے یہ مختصر سی کتاب "متاعِ زیست ہے عشقِ محمد عربیؐ" کی تفسیر اور جامی زبیری کے مافی الضمیر کے اظہار کا نہایت جامع، وقیع اور پُراثر صحیفہ ہے۔ اس کے مطالعے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا لہجہ اپنے عہد کی نعتیہ شاعری کی عام فضا میں گم نہیں ہوا بلکہ اس میں ایک ایسی انفرادیت محسوس ہوتی ہے جو اپنی شناخت کے لئے گرم و سرد سے گزرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ان کی بعض نعتیں بے ساختگی کا کامل نمونہ ہیں، ان میں ایک ایسی غنایت نغمگی اور روانی ہے جو اُن کی روحانی واردات کی غمازی کرتی ہے۔ بعض نعتوں کے ردیف میں تو کمال کا بانکپن نظر آتا ہے اور بعض میں حسن بھائی نے اپنے پیش رو اساتذہ شعراء کے کلام کا تاثر لے کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے لیکن ایسی نعتوں میں براہ راست تصرف کی کوئی شکل نظر نہیں آتی کیونکہ جامی مرحوم کا دردمند دل اپنے صادق جذبات کے اظہار کے لئے دوسرے کسی

آہنگ کا محتاج نہیں۔

ع عطا کی ہے قدرت نے سیرت مثالی
یہ جادو بیانی یہ شیریں مقالی
انوکھے ہیں انداز صورت نرالی
محمدؐ ہیں خالق کا عکسِ جمالی
دو عالم کے آقا مدینے کے والی

ع رحمتِ عالم کون ؟ محمدؐ ! صلی اللہ علیہ وسلم
نورِ مجسّم کون ؟ محمدؐ ! صلی اللہ علیہ وسلم
نبیوں کے سردار وہی ہیں، مالک اور مختار وہی ہیں
نازشِ آدم کون ؟ محمدؐ ! صلی اللہ علیہ وسلم
رشکِ مسیحا، خضرؑ کے رہبر، ساقیِ کوثر، شافعِ محشر
افضل و اکرم، کون ؟ محمد ! صلی اللہ علیہ وسلم

ع خاصانِ خدا، خدا نہیں ہیں — خالق سے مگر جدا نہیں ہیں
لیتے ہیں نام آپ کا حمد و ثنا کے بعد — افضل ہر ایک سے ہیں محمد خدا کے بعد

ع نہیں احمدؐ و احد میں کوئی فرق در حقیقت
کوئی کیا سمجھ سکے گا یہ رموزِ کبریائی

رسولِ کریمؐ کے بنی نوعِ انسان پر جو احسانات ہیں اس کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے ع

ع میں کیا تھا اور مجھے کیا بنا دیا تو نے
بھٹک رہا تھا خدا کا پتا دیا تو نے

ترا کرم ہے کہ بخشا ہے مجھ کو ذوقِ یقیں
اور اس کے ساتھ دلِ مبتلا دیا تو نے
وہ سر کہ جس میں ہوا و ہوس کا سودا تھا
حضورِ حق میں وہی سر جھکا دیا تو نے
جگر میں درد نگاہوں میں سوز دل میں تڑپ
سبھی تو مجھ کو بہ فضلِ خدا دیا تو نے

اصولی طور پر نعت کے موضوعات آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارک، شمائل کریمہ اور مغازی ہوا کرتے ہیں۔ نیز تشریح مقصد رسالت، تفہیم منصب نبوت اور اشاعتِ نظریہ توحید کے مضامین بھی۔ گویا نعت کا اسلوب ایسا ہو جو ہر عہد میں اسوہ رسولؐ، تعلیم رسولؐ، حبِ رسولؐ اور اتباع رسولؐ کی دعوت کا نقیب ہو۔ لیکن آجکل نعت گوئی کے انداز بدل گئے ہیں اور عام طور پر اس نازک مرحلۂ فن میں زیادہ احتیاط نہیں برتی جاتی۔ آنحضرتؐ سے عقیدت اور محبت کے اظہار میں اپنے جذبۂ صادق پر حد درجہ اعتماد کے ساتھ یوں بھی کہا جاتا ہے جیسے حسن بھائی نے کہا ہے ع

انکے کرم پہ ناز ہے دستِ طلب اٹھائیں کیوں — خود وہ ہمیں بلائیں گے آج نہیں تو کل سہی

اور اس طرح کے اشعار بھی کہے جا رہے ہیں ع

مجھے فکر کیا اپنی بخشش کی جاتی — مرا آسرا ہیں، مدینہ کی گلیاں

(ماہنامہ اظہار کراچی۔ نومبر/دسمبر ۱۹۸۵ء)

حمد و نعت

بہتر ہے کہ میں ابتدا ہی میں عرض کر دوں کہ میں عبدالستار مسلمؔ جالندھری کو نہیں جانتا اور ابو الامتیاز ع۔ س۔ مسلم سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہوں البتہ ع۔ س۔ مسلمؔ کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ 'نیا راہی' کے حوالے سے ان کا ہمراہی بھی رہا ہوں۔ انہیں پڑھا، باتیں کیں اور ان کے مشاغل سے تھوڑی بہت واقفیت ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے میری ملاقات دورِ اول میں ہوئی جسکو وہ نشاۃ ثانیہ یعنی ۱۹۷۹ء سے پہلے کا دور کہتے ہیں اور ادبی لحاظ سے میں اسے ان کا تشکیلی دور کہتا ہوں یعنی تگ و دو کا دور۔

اس دور میں انہوں نے ماہنامہ 'نیا راہی' کا اجراء کیا تھا اور 'ایک ٹہنی کے پھول' (افسانے)، 'اوس اور کرنیں' (غزلیں، نظمیں، گیت) اور 'اردو مرثیہ کے پانچ سال' (تاریخ و انتخابِ مراثی) شائع کیں۔ اپنی تصنیفات کے علاوہ انہوں نے شوکت صدیقی کی 'خدا کی بستی' محمد ادریس کی 'وادیٔ سندھ کی تہذیب' مولانا حسرت موہانی کی 'قیدِ فرہنگ' تحسین سروری کی 'قادر نامہ غالب' انور عنایت اللہ کی زوالِ حیدر آباد دکن سے متعلق 'قلعہ مضبوط تھا' واجد علی شاہ کی 'پری خانہ' اور مسلم ضیائی کی 'ٹیپو سلطان اور اس کے خواب' بھی شائع کی تھیں۔ یاد نہیں کہ یہ کتابیں

مجھے ہدیتاً دی گئیں، یا فروخت کی گئی تھیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ کتابیں اس دور کی ملاقاتوں کی یادگار ہیں۔

'نیا راہی' اور دوسری کتابوں کے مطالعے سے ان کے افکار اور نظریات کے ساتھ ساتھ ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کوئی بیس ۲۰ بائیس ۲۲ سال بعد جب انہوں نے خالد بن ولید روڈ پر گاڑی روک کر علیک سلیک کی تو میں انہیں پہچان نہ سکا لیکن ان کے دورِ ثانی کی بعض سرگرمیاں اور مصروفیتیں سُن کر بہت متاثر ہوا۔ معلوم ہوا مسلم صاحب اب اپنی ادبی سرگرمیوں کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور تجارت کے ساتھ ذہنی پسماندگان کی تنظیم اور اس کے زیرِ اہتمام مرکزِ تربیت کے سربراہ کی حیثیت سے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ پھر مجھے نہ تو اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ انہوں نے از سرِ نو اپنے ادبی سفر کا آغاز کب کیا۔

۱۹۸۵ء میں ایک روز مسلم صاحب میرے دفتر تشریف لائے اور اپنی تازہ تصنیف 'حمد و نعت' عنایت کی جس کے ابتدائی صفحات سے ان کے ذہنی سفر اور وارداتِ قلبی سے آگاہی ہوئی۔ ملاقات کے دوران بتایا کہ اب ذہنی پسماندگان کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے طور پر 'رحمت وقف' سے ماہانہ تیس چالیس ہزار روپے وظائف، قرضِ حسنہ اور امداد کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔ ہٰذا من فضلِ ربّی۔ 'خدا کی بستی' کے فکری اور کاروباری مخمصے میں الجھنے والا شخص اب قولِ رسولؐ 'الخلق عیال اللہ' کی عملی طور اعانت کرنے لگا تھا۔ مسلم صاحب خوش قسمت تھے کہ ان کا بچپن شہری کثافتوں سے ملوث و متاثر نہیں ہوا۔ گھریلو ماحول نے

ابتدائی تعلیم و تربیت کے دوران ہی ان کی تصریحات کی بنیادیں اسطرح استوار کیں کہ "علی الصبح چکی کی مدھر موسیقی کے ساتھ پنجابی اور پوربی نعتوں اور ذکر اذکار کی لوریوں کی گود میں سوتا اور جاگتا"۔ عالمِ شباب میں عقل و خرد کی مستانہ وار جست و خیز نے انہیں متزلزل ضرور کیا لیکن توجہ ارتداد اور الحاد کی وادیوں میں سے بغیر کسی شکست و ریخت کے بچ نکلے۔ بقول حافظ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

اردو شاعری میں غزل کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ غزل کیا ہے؟ یہ حسن و عشق کی واردات کا بیان ہے۔ محبوب کی قربت اور فرقت کا ماجرا ہے۔ اسی طرح نعت بھی عشقِ رسولؐ کی واردات کا اظہار ہے لیکن اس اظہار کی آزادی ادب، شائستگی اور حق گوئی کی پابند ہوتی ہے۔ عرفی نے کہا ہے ؎ باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

ایک مقبول صنفِ سخن کے طور پر اردو نعت گوئی کی تاریخ اتنی پرانی نہیں۔ البتہ اردو کے قدیم دواوین، قصائد اور مثنویات کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے اور یہ عمل محض اپنے عجز و انکساری کا اظہار اور موجبِ برکت اور باعثِ نجات تصور کیا جاتا تھا۔ نواب مرزا شوق کی مثنویاں زہرِ عشق اور بہارِ عشق جو محض ہوسناکی کی داستان ہیں۔ ان کا آغاز بھی حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس قدیم نعتیہ سرمایہ میں خلوص اور عقیدت کا عنصر نظر آتا ہے جو آجکل کے اکثر نعت گو شعراء کے ہاں مثقال ذرہ پایا جاتا ہے۔

یوں تو اردو ادب میں "صبحِ بنارس" کا ہی چرچا ہوتا ہے لیکن مسلم

صاحب نے اپنے ابتدائی قیامِ بنارس کی یاد کو "حمد و نعت" میں اسطرح تازہ کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر "ہندی آہنگ" میں بھی پیش کیا تاکہ آپؐ کی رحمت للعالمینی وصف اور نعمتِ خداوندی کا علم غیر مسلموں تک بھی پہنچ پائے۔ یوں بھی ان کی نعتوں میں لسانی تنوع ہے۔ وہ اپنے داخلی اور خارجی واردات کے اظہار میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ رعایتِ لفظی، تلمیحات، قرآنی آیات، احادیثِ رسولؐ اور دعاؤں سے بھی کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک خوبصورت لسانی امتزاج کے ساتھ ساتھ آہنگ کو ایک نئی راہ ملتی ہے اور ایک ایک لفظ گویا سوزِ دروں کی آنچ سے گزر کر شعر کے قالب میں ڈھل رہا ہے۔ شعری خوبیوں کے ساتھ "حمد و نعت" کا مجموعی تاثر مناجاتی اور دعائیہ ہے جس کا اثر مسلم کی عملی زندگی اور ذاتی کردار سے تو عیاں ہوتا ہے لیکن صداقت، سادگی اور برجستگی کے سبب ان کے اشعار براہِ راست دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرنے اور پڑھنے والوں کو حبِ حبیبؐ سے سرشار کر دیتے ہیں۔ یہ ایک اچھے انسان کی پاکباز عشقیہ شاعری کا گرانقدر نمونہ ہے۔

مسلم کی تخلیقات کو فنِ عروض کی بندشوں سے نہیں بلکہ عقیدت، محبت اور وارفتگی کی شدت سے پرکھیئے۔ وہ رزقِ حلال کی تلاش میں ہند سے عرب گئے اور عرب و ہند کے تعلقات کو نئی جہت اور معنی پیش کیا۔ وہ سنتِ نبوی (تجارت) کے پیرو کار ضرور ہیں لیکن الفاظ کے بیوپاری نہیں۔ ان کے اشعار میں صداقت، جوش اور روانی دیدنی ہے۔ وہ الفاظ

کی قلت کا شکار نہیں۔ پوربی اور پنجابی زبانیں تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں اور حقیقت میں وہی اردو کا بھی خمیر ہیں۔ اس وجہ سے وہ محسن کاکوروی، امیر مینائی اور مولانا احمد رضا خاں کے رنگ میں نعت نبی کہتے ہیں تو ساتھ ساتھ حالی، اقبال اور ظفر علی خاں کی سی جدت طرازیاں بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ ان کے معرب و مفرس قافیہ بھی دلچسپ اور عام فہم معلوم ہوتے ہیں اور اس سے حسنِ سخن اور لطافتِ شعری پر کوئی حرف نہیں آیا کیوں کہ انہوں نے مروجہ ادبی رجحان اور شعری روایت سے گریز کرتے ہوئے اپنے سچے جذبہ کو راہنما بنایا ہے۔ ایک اور بات جو مسلم کو منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عشقِ رسولؐ کے اظہار میں ادب اور احتیاط کا قرینہ ہے۔

افسوس ہے کہ روزمرہ کے بے ثمر پیشہ ورانہ مصروفیتوں کی باعث میں تقابلی مطالعہ پیش کرنے سے قاصر ہوں تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ مسلم کے ذہنی ارتقا میں صوفی دانشوروں اور غیر مسلم سادھوؤں اور کویوں کے عارفانہ کلام کا اثر نظر آتا ہے۔ گویا انہوں نے قدیم اور جدید طرز کا ایک خوشنما اور پاکیزہ مرقع نعت پیش کیا ہے جو ایک طرف دنیا اور آخرت میں ان کی سرخروئی کا باعث ہے تو دوسری طرف قارئین کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا ایک دلچسپ، دلنواز اور سبق آموز صحیفہ ہے جسکو محض پیشہ ور نعت گو کا مجموعہ نہیں کہا جا سکتا۔

(موتمر عالم اسلامی (کراچی) کے زیر اہتمام "اواری ٹاورس" ہوٹل میں منعقدہ تقریب رونمائی کے لئے لکھا گیا۔ (۱۶ جنوری ۱۹۸۷ء)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سیرت کا موضوع بہت وسیع ہے۔ انسانی زندگی کے جتنے بھی پہلو ہو سکتے ہیں ان کے مقابلے میں سیرت کے عنوانات کی کوئی حد نہیں کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشر اور عبد کی انتہا سے بہت ارفع و اعلیٰ، انسانِ کامل نبی اور رسول کی حیثیت میں ایسی ہستی اور مقام کے مثالی پیکر تھے جس کی مانند دنیا میں نہ تو پہلے اور نہ ہی آج یا کل آپ کا ثانی ملے گا۔ آپ ظلمات میں نور، جہل اور بے خبری میں مدینۃ العلم، سماجی استحصال اور استیصال کے ماحول میں رحمۃ للعالمین اور مکارم الاخلاق تھے۔ دنیا کے طول و عرض میں آپ کی پاک، صاف اور روشن زندگی کے بارے میں مختلف زبانوں اور اصنافِ سخن میں سینکڑوں ہزاروں انسان اپنی عقیدت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے بھی عاجزی سے اپنی کم مائیگی کا اقرار کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں شامل ۴۰ مضامین کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے جیسے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کہا ہے ؎

کتیئم کیئن کی ، چھا بدھائیاں

اس بیت کو اردو میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب کچھ بویا ہی نہیں تو کاٹیں گے کیا۔

انسان کو زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کی زندگی کا رُخ بدل ڈالتے ہیں۔ میں نے مدرسہ مجیدیہ، گڑھی یاسین (سندھ) میں ابتدائی دینی اور پرائمری تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران ۱۹۳۹ء میں صوبہ سندھ کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (ناظمِ تعلیم) مقرر ہونے کے بعد شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ نے مُلّا اسکولوں کے معائنے کا پروگرام بنایا اور اس سلسلے میں وہ مدرسہ مجیدیہ (گڑھی یاسین) میں بھی تشریف لائے۔ ان کی معیت میں سید عبدالحسین موسوی بھی آئے تھے جو اس وقت مُلّا اسکولوں کے انسپکٹر تھے۔ اس موقع پر مجھے سیرت النبیؐ پر سندھی میں لکھی ہوئی کتاب 'ہمارے پیارے رسولؐ' انعام کے طور پر ملی۔ یہ کتاب جناب محمد بخش واصف مرحوم کی تصنیف تھی اور اس کو سندھ مسلم ادبی سوسائٹی (حیدرآباد سندھ) نے شائع کیا تھا۔ یہی کتاب میرے لئے سیرت کے مطالعہ کی اوّلین محرک بنی۔ کچھ عرصہ بعد گڑھی یاسین ہی میں ایک مسلمان افسر (شاید اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز یا رجسٹریشن افسر) کے پاس مولانا فضل احمد غزنوی مرحوم کی تالیف 'سیرت النبیؐ' (حصہ اول) دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ اپنے استاد، مدرسہ کے مہتمم اور مسجد کے پیش امام، قاری حافظ مولوی حاجی نور محمد سیٹھان مرحوم کے وعظ اور خطباتِ جمعہ نے بھی میری معلومات میں اضافہ کیا۔ شکارپور کے قیام (۱۹۴۵ء - ۱۹۴۷ء) کے دوران حکیم مولانا عبدالکریم چشتی مرحوم کے کتابچوں اور محافلِ میلاد میں اُن کی بصیرت افروز تقاریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اسی عرصہ میں مجھے

بی۔ ایم۔ صالح برادراں (سکھر) کے توسل سے سیرت کمیٹی، پٹی (ضلع لاہور) کی جانب سے شائع کردہ درسِ قرآن اور سیرت لٹریچر مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا جو اردو اور سندھی ترجمہ کی صورت میں مفت تقسیم کئے جاتے تھے۔ یہ بڑی قابلِ قدر و تحسین تبلیغی خدمت تھی۔ خداوند کریم طرفین کو اپنی لامحدود رحمتوں اور نعمتوں سے نوازے۔

۱۹۴۷ء میں کراچی آنے کے بعد مجھے سیرت سے متعلق کتابوں اور میلاد کی محفلوں میں شریک ہونے کے مزید مواقع میسّر آئے۔ جب سندھ مدرسۃ الاسلام کے ہاسٹل سے سندھ مسلم کالج موجودہ عمارت میں منتقل ہوا تو جناب ایس۔ ایم میر سے ملاقات ہوئی جو اب بھی اسلامی کتب کا کاروبار کرتے ہیں۔ مجھے حاجی سر عبداللہ ہارون وقف کی جانب سے کچھ رقم ماہانہ وظیفہ کے طور پر ملتی تھی جس سے میں صرف کتابیں خرید کرتا تھا جو سیرت، تاریخ اسلام اور مسلم مشاہیر سے متعلق تھیں۔ بی اے کے نصاب میں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کتاب 'خطباتِ مدراس'، علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ کی کتابیں 'النبی الخاتم' اور 'الدین القیم' اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی کتابیں 'عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی'، 'رسول اکرم کی سیاسی زندگی' اور 'عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ' پڑھیں اور اس طرح پڑھیں کہ ان کتابوں کی اکثر عبارتیں ذہن پر نقش ہو گئیں۔ اب میرے کتب خانے میں سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں میں ۱۰۰ کتابیں سیرت کے موضوع پر موجود ہیں جن میں بعض دورِ جدید کے حالات اور تقاضوں کو

مدِنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں ۔

سیرت النبیؐ کے سلسلے میں میرا پہلا مضمون 'رسولِ کریم کے خطوط' کے عنوان سے روزنامہ 'الوحید' (کراچی) میں ۳۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو شائع ہوا دوسرا مضمون بعنوان 'عہد کی انتہا' جو معراج النبی کے بارے میں تھا روزنامہ 'الوحید' میں ۱۱۔ اپریل ۱۹۵۳ء کو شائع ہوا جس کو شیخ عبدالمجید سندھی مرحوم نے بہت پسند کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۶۰ء میں جب حیدرآباد میں رہنے کا اتفاق ہوا تو روزنامہ 'عبرت' کے دفتر میں شیخ علی محمد کے پاس مولانا غلام محمد گرامی مرحوم سے ملاقات ہوئی اور اس پہلی ملاقات ہی میں واقفیت کا حوالہ یہی مضمون تھا۔ خدا بخشے گرامی صاحب کو جنہوں نے بعد میں میری تحریروں کی پذیرائی کی اور بڑی ہمت افزائی کرتے رہے ۔

اس کتاب کا پیش لفظ علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی صاحب چیئرمین، سندھی ادبی بورڈ، اور ڈائریکٹر، شاہ ولی اللہ اکادمی، حیدرآباد نے رقم کیا اور اس کا گردپوش عالمی شہرت یافتہ پاکستانی آرٹسٹ جناب آذر ذوبی کے فکر و فن کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل چالیس (۴۰) مضامین پر مشتمل ہے ۔

حیات النبیؐ

جمالِ حبیب، مثالی بچہ، الصادق الامین، بہترین پڑوسی، شبِ جلال و جمال، عہد کی انتہا، مہاجرِ مدینہ، اخوت و مساوات، حسنت جمیع خصالہ، مثالی حاکم، مکتوباتِ رسول، عہدِ نبوی میں پبلسٹی کا طریقہ، عہدِ نبوی میں مسجد کی اہمیت، انسانیت کا منشورِ اعظم، رسولِ کریم کا اہالیانِ سندھ

کے لئے سندیسا، عید میلادالنبی کے بعد اور اغثنی یا سیدا !

رسولِ کریمؐ کا تاریخ ساز کردار

انسانِ کامل، نبی کریم کا تاریخ ساز کردار، مدبرِ عالم، نظم و ضبط، بڑوں کا ادب و احترام، فیاضی و سخاوت، میانہ روی، یرغمالیوں کا مسئلہ اور 'وہ اپنے پرایوں کا غم کھانے والا'۔

رفعنالک ذکرک

'رفعنالک ذکرک'، شیخ المشائخ شاہ لطف اللہ قادری، میون شاہ عنایت رضوی، مخدوم عبدالرؤف بھٹی ہالائی، پیر سید علی گوہر شاہ اصغر، مولانا سید تاج محمود امروٹی، ٹھل فقیر، مولوی حاجی احمد ملاح، مولوی عبداللہ اثر کا نعتیہ کلام 'وہ شمع اجالا جس نے کیا' ڈاکٹر سر محمد اقبال اور عشقِ رسول' اور 'قدیم چین میں نعت گوئی'۔

ضمیمے

'النبی الامین والقرآن المبین' اور 'ما فی الضمیر کی سرگزشت'۔

ان مضامین میں سے بعض اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے تھے اور بعض ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر کئے گئے۔ دو چار تقریریں اور چند مضامین اردو میں لکھے تھے جن کا سندھی ترجمہ کتاب میں شامل ہے۔ مختلف اوقات اور ماحول میں لکھنے کی وجہ سے مضامین میں بہت سی باتوں کی تکرار نظر آتی ہے تاہم اس سے کوئی کوفت یا طبعِ سلیم پر بوجھ کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ حقیقت اور صداقت کا اعادہ ابلاغ کا اسلامی نظریہ ہے اور ایمان اور اعتقاد کی مضبوطی

کا باعث بھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے یہ تکرار صلوٰۃ وسلام کا عنوان بنتی ہے۔

اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے بعض اہم واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان مضامین سے وابستہ بعض مضامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تاریخ ساز کردار سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرے حصے میں دیئے گئے ہیں۔ تیسرے حصے میں سیرت کے بارے میں سندھ میں لکھی گئی قدیم وجدید معروف کتابوں اور کلاسیکی نعت (مولود) گو شاعروں کا مذکور ہے اور اس حصے کے آخر میں دو مضامین بعنوان "ڈاکٹر سر محمد اقبال کا عشق رسول" اور "قدیم چین میں نعت گوئی" بھی شامل کئے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں دو ضمیمے دیئے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمے میں قرآن حکیم کی ان آیات کا ترجمہ دیا گیا ہے جن میں نبی کریم کی سیرت سے متعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ حوالے ملتے ہیں۔ دوسرے ضمیمے میں تین ادارئیے شامل ہیں جو محکمہ اطلاعات، سندھ کی جانب سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ "اظہار" اور سندھی ماہنامہ "پیغام" کی ادارت کے دوران (۷۶-۱۹۸۲ء) میں شائع کئے گئے خاص سیرت اشاعتوں سے ماخوذ ہیں۔

میں نے کتاب کے چاروں حصوں کو اپنے چند محسنین کے نام منسوب کیا ہے۔ پہلا حصہ "حیات النبی" حکیم مولوی فتح محمد سیوہانی، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ سید مناظر احسن گیلانی، مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان

منصور پوری مرحومین اور محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے نام منسوب ہے۔ دوسرا حصہ "رسول کریم کے تاریخ ساز کردار" سے متعلق ہے حاجی سر عبداللہ ہارون، علامہ آئی آئی قاضی اور جناب اے کے بروہی مرحومین کے نام منسوب ہے۔ تیسرے حصے "رفعنا لک ذکرک" کا انتساب حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹی، جناب محمد بخش واصف، حکیم مولوی عبدالکریم چشتی، مولانا حاجی احمد ملاح اور حافظ محمد احسن چنا مرحومین کے نام ہے اور چوتھا حصہ "النبی الامین والقرآن المبین" حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، مولانا مفتی صاحب داد سلطان کوٹی، قاضی عبدالرزاق اور قاری حافظ نور محمد پٹھان کے نام سے منسوب ہے۔

مضامین کے اس مجموعے کو سیرت النبی کے بارے میں مکمل کتاب تو نہیں کہا جا سکتا البتہ مضامین کی جامعیت، مصدق مواد اور مثبت فکر کی بنیاد پر اس کو "گل سرسبد" کہا جا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ کتاب شائع کی ہے وہ انشاء اللہ ضرور حاصل ہوگا خصوصاً نوجوانوں اور طلباء کے لئے اس کتاب میں فکر ونظر کی بہت سی باتیں ہیں اور مادی اور روحانی ترقی کی راہوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی تعلیمات اور اقدام کے نتیجے میں جو تاریخی اور یادگار تبدیلیاں رونما ہوئیں اور صلاح وفلاح کی جو رن طلوع ہوئی اس ہی سرگزشت کا اجمالی تذکرہ اس کتاب کے صفحات کی رونق اور زینت ہے اور یہی نبی کی دعوت وتبلیغ کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط (ھود۔ ۸۸) (یعنی
میں تو اپنے حتی المقدور (لوگوں میں معاملے کی) اصلاح چاہتا ہوں اور بس۔

میں نے یہ کتاب دراصل جناب اے کے بروہی مرحوم کے ایماء پر تصنیف کی۔ مختصر نشستوں میں، میں نے اس مومن صفت دانشور کی باتیں اور نکات سنے اور ان سے استفادہ کیا۔ رسول کریمؐ کے تاریخ ساز کردار سے متعلق ان کو ایک جامع و مبسوط کتاب لکھنے کی دیرینہ تمنا تھی اور جب میں اپنی کتاب کا مسودہ دکھلانے اور اس پر حسب معمول مقدمہ لکھوانے کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے ان کی مندرجہ بالا مجوزہ تصنیف کی پیش رفت کے بارے میں معلوم کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور گلوگیر آواز میں بتایا کہ وہ اس ضمن میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کرسکے اور مجھ سے کہا کہ میں اپنی کتاب میں اسی عنوان سے بعض باتوں کا اضافہ کروں۔ میں نے اُن کی خواہش کا احترام کیا لیکن افسوس ہے کہ وہ نہ تو مقدمہ لکھ سکے اور نہ ہی اس کتاب کو دیکھ سکے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ وہ آج کی اس تقریب سعید میں موجود نہیں ہیں۔ مجھے اپنی کتاب پر ملنے والے اعزاز و انعام سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا کہ ان کی ناگہانی وفات سے دُکھ ہوا۔ اگر آج کی اس تقریب میں وہ موجود ہوتے تو میں ان سے کم از کم یہ شکایت ضرور کرتا کہ سیرت پر لکھی گئی کتابوں پر دیئے جانے والے انعامات کی رقوم میں امتیاز کیوں روا رکھا گیا ہے جبکہ سورہ الروم کی بائیسویں آیت میں واضح طور پر ارشادِ ربانی ہے کہ

زبانوں کا اختلاف، اللہ کی نشانیوں میں سے ہے یعنی سب زبانیں بلاکسی تفریق کے اللہ کی نشانیاں ہیں اور ان کی یکساں قدر و منزلت تسلیم کی جانی چاہیئے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتابوں پر انعام دیتے وقت زبان کے دائرۂ اثر کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جانا چاہیئے کہ انعام یافتہ کتابیں کتنی تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ سیرت کی انعام یافتہ انگریزی، اردو اور سندھی کتابیں ایک ایک ہزار شائع ہوئی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آجکل کتب بینی کا رواج اتنا ہمت افزا نہیں۔ بہرحال میری سوچ کے مطابق قرآن مجید کے مندرجہ بالا حکم کے سامنے کوئی منطق یا دلیل اتنی اہمیت نہیں رکھتی اور کتابوں پر دیئے گئے انعامات میں امتیاز کا کوئی جواز نہیں۔ والسلام۔

(بارھویں قومی سیرت کانفرنس منعقدہ اسلام آباد ۱۲، ۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۵، ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۸ء کے دوران سندھی کتاب ’محمد رسول اللہؐ‘ پر حکومت پاکستان کی طرف سے ’اول انعام‘ اور ’سندِ امتیاز‘ ملنے کے موقع پر تقسیم کیا گیا)

—ooo—

کراچی سے گنبدِ خضرا تک

مجھے آج کے اجتماع میں حاضرین کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر خوشی ہوئی البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کتنے اصحاب کو مطالعہ کا بھی شوق ہے۔ افسوس ہے کہ آجکل ہمارے معاشرے میں علم یا مطالعے کے منصب کو کبھی سمجھا نہیں گیا۔ علم کا حصول محض ڈگریاں حاصل کرنے تک اور مطالعے کی ذمہ داری محض ایک دو فیصد پڑھے لکھے افراد تک محدود رہی جس کا نتیجہ ہم انتشار اور فساد کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور واقعات کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ ہی سماجی نفسیات کو مہمیز لگا کر اجتماعی شعور کی تشکیل کرتا ہے۔ ہر دور کے جغرافیائی، سماجی اور سیاسی تقاضے اصلاح اور تراش خراش کے فکری تغیر و تبدل کے مابین منضبط رابطے، انسانی رشتوں، جذبوں اور تقاضوں، خواہشوں اور ضرورتوں کی نیابت میں جن زاویوں کو ابھارتے ہیں وہ دراصل سماجی بیداری کی وہ لہر ہوتی ہے جسے ہم 'اجتماعی شعور' کا نام دیتے ہیں۔

فرد کا شعور اور اس کا پورا عضویاتی نظام ایک خاص ڈھب پر ترتیب پانے کے بعد اجتماعی شعور کی ترتیب و تشکیل میں کردار ادا کرتا ہے اور یہ بھی کہ انسانی شعور کو متاثر کرنے میں مطالعے کا کردار غیر معمولی ہے۔

انفرادی اور اجتماعی کردار سازی میں ایک اہم وسیلہ کے طور پر مطالعہ ہمیشہ انسان کا رفیق اور رہنما رہا ہے۔ وسیع مطالعے کو ہم علم اور کتاب کا نام دے سکتے ہیں جو ایک نامیاتی قوت بن کر انسان کی انفرادی اور اجتماعی تکمیلیت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتاب انسانی زندگی کی ایک بنیادی قدر ہے جس کی بہترین مثال ہمیں مذہب کے حوالے سے ملتی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے صرف چار برگزیدہ شخصیات ایسی ہیں جن کی امتیں یا پیروکار آج کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان چاروں انبیاء پر اللہ جل شانہٗ نے اپنی مقدس کتابیں نازل فرمائیں باقی پیغمبروں کے بارے میں معلومات بھی ان ہی کتابوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہیں۔

ہم جب کبھی سیر و سفر اور سیاحت کی بات کرتے ہیں تو لامحالہ مسافر کی شخصیت کا بھی تجزیہ کرتے ہیں کیونکہ سفرنامہ مسافر ہی کی سرگزشت کا احوال ہوتا ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے سیاح گزرے ہیں جن کے سفرناموں میں حال کو ماضی سے منسلک رکھا گیا ہے تاکہ مستقبل کے متعلق انسان سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے۔ اس ضمن میں بعض ایسے سیاح بھی تھے جن کی مثل کوئی دوسرا سیاح پیدا نہیں ہوا۔ یونانی سیاح پالٹمی، چینی سیاح ہیوسانگ، یورپی سیاح مارکوپولو، کولمبس، واسکوڈی گاما، مسلم سیاح مسعودی، اصطخری، ابن حوقل، المقدسی، ابن بطوطہ، شیخ سعدی وغیرہ۔ ان میں سے چند سیاح برصغیر جنوبی ایشیا میں آئے جن کے سفرناموں میں ہمارے ماضی کے بعض نقوش محفوظ ہیں۔

قدیم زمانے میں سفر کی نوعیت اور معلومات کے ذرائع اور ان سے استفادہ کرنے کے طور طریقے مختلف اور بسا اوقات مشکل تھے۔ اسکے مقابلے میں موجودہ دور میں بہت سی آسانیاں، سہولتیں اور تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں مراعات کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ادب کی پرانی روایات کو جن کے مطابق داستانیں اور کلیات مرتب کی جاتی تھیں اب قبولیت عام حاصل نہیں
آجکل اگر اصنافِ ادب میں کوئی صنف زیادہ مقبول ہے تو وہ ہے سفر نامہ۔ ایک طرف تو وہ کثرت سے لکھے جا رہے ہیں اور دوسری طرف اس میں اتنا تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے کہ بظاہر اس غیر اہم صنفِ ادب نے کہانیوں، ناولوں اور شاعری کے مجموعوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

سفر ناموں پر اتنی توجہ کا ایک سبب تو یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے بیرونی ممالک جانے کے زیادہ مواقع میسر آئے ہیں۔ کالے دھن کی فراوانی، مملکتی امور سے متعلق کانفرنسیں اور ثقافتی وفود کے تبادلے، مواصلاتی سہولتوں اور دنیاوی الجھنوں سے فرار کے رجحانات سمیت اس کے چند اسباب ہیں۔ دوسرے ملکوں اور معاشروں کی سیر نے لکھنے والوں کے ذہن، شعور اور طرزِ احساس کو بھی بہت کچھ دیا ہے جس کی وجہ سے انہیں موضوع کی تلاش اور کاوش سے کسی حد تک چھٹکارا مل گیا ہے۔ سفر نامے کی مقبولیت کا سبب یہ بھی ہے کہ ایک تو خود دنیا کے ہر خطے اور قوم کے بارے میں معتبر معلومات اور تہذیبی رنگارنگی قاری کو گھر بیٹھے میسر آ جاتی ہے۔ دوسرے، واقعات اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مشاہدوں میں اسے کہانیوں سے بھی زیادہ

لطف آتا ہے۔

بہر حال اب تک جو سفر نامے ہمیں میسر ہیں ان کو تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جن میں کسی نہ کسی ملک کی معاشرتی جھلکیاں، تہذیبی عوامل، تاریخی اور سیاسی معلومات کی عکاسی زیادہ ملتی ہے اور پھر واقعات اور سیر کی مسلسل تصویر کشی قاری کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ دوسرے وہ سفر نامے جن میں واقعات اور معاشرت کی عکاسی کے ساتھ مسافر کا ردِ عمل اور اس کا ذہنی سفر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس قسم کے سفر ناموں میں ایک دوہری فضا نظر آتی ہے جس میں ایک تو سفر سے متعلق ہوتی ہے جس سے وہ دوچار ہے اس کو 'لمحۂ موجود' کہہ لیجئے اور دوسری فضا وہ ہوتی ہے جس کو وہ اپنے باطنی یا ذہنی سفر سے پیدا کرتا ہے۔ اس کو اس کی 'خود شناسی' کہا جا سکتا ہے۔ ان معنوں میں دوسری قسم کے سفر نامے بڑی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ آج ہم ایک ایسے ہی سفر نامے کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے ہوٹل میں جمع ہوئے ہیں۔ کاش! یہ ادبی اجتماع کسی پبلک ہال میں ہوتا جو کہ متمدن قوموں کا شعار رہا ہے۔ تیسرے قسم کے سفر نامے جو آجکل فٹ پاتھوں اور ریلوے اسٹالوں کی زینت بنے نظر آتے ہیں وہ 'لاسٹ لٹریچر' قسم کی چیز ہے جس کا مقصد وقت پاس کرنا اور نفس کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ ان میں ضمناً چند تاریخی حقائق کا ذکر تو ضرور ہوتا ہے لیکن جنس اور جرم کے ساتھ مسافر کی ذہنی اختراع کی ایک طویل رومانی داستان ملتی ہے۔

مجھے آج آپ کے سامنے سفرناموں کا تنقیدی جائزہ پیش نہیں کرنا اور نہ ہی قدیم و جدید سیاحوں کے تجربوں اور مشاہدوں کا موازنہ مقصود ہے کیونکہ میں انسان کی خود آگاہی کے جذبے کو نہایت اہم سمجھتا ہوں اور یہی انسانی معراج کا ذریعہ اور وسیلہ ہے کیوں کہ انسان بذاتِ خود ایک مسافر ہے، ایک ایسا مسافر جس کو نہ تو مسافت کا پتہ ہے اور نہ ہی مدت قیام کا، البتہ اسے اپنی منزل کا لامحالہ پتہ ہے کہ ایک دن، ایک ساعت میں اس کو اس دارِ فانی کو چھوڑ کر دارالبقا جانا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے ان چند مستعار لمحات کی سرگزشت رقم کرے تو کیا عجب کہ انفرادی اور اجتماعی طور پہ انسان کی زندگی میں عظیم الشان تغیر رونما ہو جو معاشروں، ملتوں اور مملکتوں میں امن و آشتی، صلاح و فلاح کا سماں پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔

ڈاکٹر خان صاحب کی کتاب 'کراچی سے گنبدِ خضرا تک' کی ایک خوبی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ صاحب فکر و نظر ہیں اور اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے استدلالی طرز نگارش رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کا ایجاز کتاب کا اعجاز ہے۔ انہوں نے اجمالی طور پر ایسے سب ہی مقاماتِ مقدسہ کا بھی ذکر کیا ہے جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے کسی نہ کسی حوالے سے تعلق تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ سنگ و خشت کے روپ میں نظر آنے والے مقام زیادہ کام آتے ہیں اور اس لئے

اس کو اپنی تاریخ اور نظریہ سے روشناس رکھنے کے لئے اینٹ پتھر سے بنی ہوئی نشانیاں یعنی مساجد، مقابر یا مکانات بہت ضروری ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب حرمین شریفین میں ان مقامات کے محض تخیلاتی نقوش ہی ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں کیونکہ ان میں سے بہت سے مقامات پر جدید طرز کی تعمیرات اپنی فنی خوبصورتی اور مفادِ عامہ کے لیبل لگائے ہوئے کھڑی ہیں ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

(اقبال)

یہ مسئلہ آج کی تقریب کے موضوع سے براہ راست تعلق تو نہیں رکھتا لیکن بے محل بھی نہیں۔ میری طرح بہت سے اور لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتے ہیں کہ ان اساطیر اور آثار کے مٹائے جانے کے عمل کو تاریخ کی تائید حاصل ہے یا اس کا تعلق کسی مسلک کے ابلاغ اور عمل سے ہے۔

آج کی محفل میں جن بزرگوں، ہم عصروں اور نوجوانوں نے محترم ڈاکٹر ایچ بی خان صاحب کی تازہ تصنیف 'کراچی سے گنبدِ خضرا تک' کے بارے میں اپنے اپنے مطالعہ کے موجب تقریریں کی ہیں، میں خود ان کے زریں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوا۔ مجھے احساس ہے کہ میں اس کسوٹی پر پورا اتر نہیں سکتا جو کہ ایک مسلمان کا شیوہ ہونا

چاہیئے۔ البتہ میرے خون میں، میرے قلب و ذہن میں جو شرارہ تابندہ ہے اس کی گرمی کی وجہ سے اتنی سوجھ بوجھ ضرور رکھتا ہوں کہ اسلام کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ ہمارے دین کی اساسی اقدار ہم سے کیا تقاضا کرتی ہیں اور یہ کہ ہمیں اپنی زندگی کس نہج پر بسر کرنی چاہیئے۔

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے حج ایک فرض ہے تاہم حرم کا سفر امرِ خداوندی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے دوران اپنی دلی کیفیات کا بیان قرطاس و قلم کے سپرد کرنا میرے خیال میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کیونکہ یہ واردات مصنوعی نہیں بلکہ القائی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ایسے لمحات کو کس طرح قلم بند کیا جاسکتا ہے؟ بہرحال ہمارے بہت سے بزرگوں نے اس مقدس سفر کے متعلق کتابیں شائع کی ہیں جو کسی نہ کسی زاویہ سے اہمیت اور افادیت کا پہلو رکھتی ہیں اور اس ضمن میں ڈاکٹر ایچ بی خان کا سفرنامہ بھی آتا ہے جنہوں نے اپنی تصنیف بعنوان 'شاہراہِ مکہ' کی وجہ سے، جس میں عالمِ اسلام کی اسلامی تحریکات کی تاریخ منضبط کی گئی ہے، بڑا نام پایا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی دوسری کتاب 'برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علما کا کردار' کے ذریعے بیسویں صدی میں جنوبی ایشیا کے علما کی سیاسی جدوجہد کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفرنامہ بعنوان 'کراچی سے گنبدِ خضرا تک' میں طلوعِ اسلام سے عصرِ جدید تک کے طویل مطالعاتی اور کسی قدر

جسمانی سفر کی روداد لکھی ہے اور اس کے ساتھ ہی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے مذکور میں تاریخی دستاویزات سے استفادہ کیا ہے۔ سفرنامے کے ابتدائی صفحات میں سفرِ حج سے متعلق بعض انتظامی امور اور دشواریوں کا ذکر کیا ہے اور لوگوں کی لاعلمی کے باعث فریضۂ حج کی صحیح ادائیگی میں خلل پڑنے کے خدشات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۶ میں طبع ہوئی تھی اور اب تک ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ بہت سی شکایات کا ازالہ ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان چند صفحات میں بھی کچھ اور مفید باتیں بیان کی جاتیں تو اچھا تھا کیونکہ وقتی طور پر پیدا ہونے والے مسائل کو کتاب میں شامل کرنے سے تصنیف کی مستقل حیثیت اور اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں سعودی عرب کے حکمرانوں کا اس سفرنامے میں جس انداز سے ذکر کیا گیا ہے وہ مجھے مناسب اور موزوں نظر نہ آیا کیونکہ اس طرح کا 'تذکرۂ شاہاں' انہوں نے پہلے ہی 'شاہراہ مکہ' میں شامل کیا تھا۔ ان مضامین کا اعادہ کرنے کی بجائے خان صاحب ان کو علیحدہ تصنیف کا موضوع بناتے تو اچھا تھا۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سفرنامہ جدید دور کی بعض ضروریات کو پورا کرتا ہے گو اس میں چند مزید باتوں کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی ہے جیسے آسان 'اردو عربی بول چال' جو عازمینِ حج کے لیئے مفید ثابت ہوتی اور حرمین شریفین میں برصغیر کے مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی خدمات۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر ایچ بی خان جیسا دانشور

محقق اس طرف توجہ دیتا تو شاید سندھ اور ہند کے خدامُ الحرمین شریفین کی ایک اچھی خاصی فہرست مرتب ہوجاتی اور ان کے عشقِ رسولؐ کی ادنیٰ سی جھلکیاں ہمارے لئے مشعلِ راہ بنتیں۔

مجھے احساس ہے کہ اللہ کی اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے سے انسان کی کیا قدر و قیمت ہے اور یہ کہ اس کی عقل و ادراک کی رسائی کس طرح اور کس حد تک کائنات کے اسرار و رموز کو منکشف کرسکتی ہے۔ تاہم ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ انسان آدم کی اولاد ہے اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا پوری طرح احساس ہے اور میں اپنے کو آج کی محفل کی سربراہی کا اہل نہیں سمجھتا۔ تاہم آپ نے میری جو عزت افزائی کی ہے میں اسے رب العزت کی طرف سے اپنی مزید ہدایت و اصلاح کے سلسلے میں ایک استعارہ سمجھتا ہوں۔ شاید مجھ پر بھی توجہ کی نظر ہونے کو ہے! کیا میں اسے اذنِ سفر سمجھوں؟

آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا عملی ثبوت دیا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

میں اس شہر میں لگاتار دس سال تک رہا اور اسی دوران علما ، سالکوں، صوفیوں اور رندوں کی محفلوں میں شریک رہا۔ اس میل جول اور مودت کے نتیجے میں مجھے بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ یہ باتیں میرے لئے زادِ عقبیٰ تو بن نہ سکیں البتہ اس سے مجھے عبرت اور پند و موعظت کا اچھا اور رہنما درس ملا۔ "صلحِ کل" کا سندیسا جسے میں نے حرزِ جاں بنالیا۔ یہی

پیغام اس شعر سے بھی ملتا ہے جو سرفراز نے بنائے حیدرآباد کی تاریخ کے طور پر کہا تھا۔

یارب اجعل ہٰذا البلد آمنا (۱۱۸۲ھ)

(یعنی یارب! اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا۔)

میں نے سندھی روزنامہ "عبرت" میں ۸ مئی ۱۹۷۱ء کو ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "رسول کریمؐ کا اہالیانِ سندھ کے لئے پیغام"۔ یہ پیغام سیرت کی کتابوں میں درج ہے۔ رسولِ وحدتؐ نے انصار کے بارے میں وصیت کی اور فرمایا کہ اے مہاجرین! تم اس حالت میں ہو کہ بڑھ رہے ہو اور انصار اس حالت میں ہیں کہ وہ نہیں بڑھ رہے۔ انہوں نے مجھے اپنایا۔ میں اب جارہا ہوں اس لئے وصیت کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے جسم کے پیرہن اور میرے زادِ راہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے واجبات کو پورا کردیا ہے اور اب ان کے حقوق باقی رہ گئے ہیں۔ اُن میں سے اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرنا اور لغزش کرنے والوں سے درگزر کرنا۔ (زرقانی جلد ۸)

عشقِ رسول کا دعویٰ کرنے والے مہاجر و انصار بزرگو! میرے بھائیو اور بہنو! ہم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو صمیمِ قلب سے یہ کہہ دے :

لبیک یارسول اللہ لبیک! اے شافعِ محشر! ہم گنہگار ہیں، ہم تجدیدِ عہد کرتے ہیں کہ جذبۂ مواخات کو روبہ عمل لاتے ہوئے، امن و آشتی کا ماحول بحال کریں گے تاکہ پاکستان مضبوط اور مستحکم ہو اور ملتِ پاکستان

کسی کی محتاج نہ ہو۔

میں آپ کے خلوص، محبت اور نیک نیتی کے جذبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ

مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ، لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ

یعنی جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں، وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں ہوگا۔

(دی آئی پی آرٹس کونسل، حیدر آباد کے زیرِ اہتمام جناب ایچ بی خان کی تصنیف "کراچی سے گنبدِ خضرا تک" کی تقریب رونمائی منعقدہ ۳۱ مارچ ۲۰۰۸ء کیلئے لکھا گیا)

—ooo—

مدینہ منوّرہ کی عظمت و محبوبیت

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے عشقِ رسُول کے اظہار کے طور پر بہت سے اشعار کہے ہیں۔ انہیں بجا طور پر دیوانۂ حجاز کہا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک جس طرح حقیقت مجاز میں پوشیدہ ہے اسی طرح موت کے پردے میں حیات ہے اس لئے اقبال خود زمینِ حجاز میں موت کی تمنا رکھتے تھے (ارمغانِ حجاز) اسی طرح بلادِ اسلامیہ کا ذکر کرتے ہیں تو اُمتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ پر اشکت باری کی بجائے دلاسا دیتے ہیں اور دلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کائنات اسیر مکاں میں یثرب (مدینہ) کو ملتِ اسلامیہ کا مرکز قرار دیتے ہیں کیونکہ ؎

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خواب گاہِ مصطفٰؐ!
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظمؐ کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اس مرکزِ محبت اور شہرِ آرزو کا ذکرِ خیر آج کی تقریب کا موضوع ہے چنانچہ محبت کی لَے میں لکھی ہوئی اس تحریر کو نہ تو مسلکوں کے منطوق کی بھینٹ چڑھایا جائے اور نہ ہی اس کو فسادِ فی سبیل اللہ کا آلہ بنایا جائے۔ یہ میری التجا ہے۔

اقبال احمد صدیقی صاحب نے حرمین شریفین کی زیارت سے مستفیض ہونے کا ثبوت مدینہ منورہ کی عظمت و محبوبیت کی شکل میں نہایت ادب اور انکساری سے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب جتنی خوبصورت طباعت، پُرکشش گرد پوش اور رنگین تصاویر سے مزین ہے اتنی مواد کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ یوں تو مدینہ کی تاریخ، جغرافیہ اور سیاحت سے متعلق بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ کچھ حجازِ مقدس کے فنِ عمارت سازی اور آثارِ قدیمہ کے بارے میں بھی ہیں لیکن اقبال احمد صدیقی نے اپنے سفرنامے کو مدینہ منورہ کی تاریخ کے روپ میں پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ رسولِ اکرمؐ، اہلِ بیتؓ، خلفائے راشدینؓ، صحابیاتؓ اور صحابہ کرامؓ اور دوسرے بزرگوں مثلاً کاتبانِ وحیؓ، مؤذنؓ، آپؐ کے قاصدؓ اور خدامؓ وغیرہ کا احوال شامل کر کے اپنی تصنیف کی معنوی خوبی اور اہمیت میں اضافہ بھی کیا ہے جو یقیناً قابلِ ستائش ہے۔

اس کتاب میں حرمین شریفین میں جدید تعمیر و توسیع کے منصوبوں کا بھی

ذکر کیا گیا ہے جو بظاہر متاثر کن ہے اور شاید جدید دور کے معاشرے کی عام نفسیاتی روش کے مطابق ہے لیکن اس اقدام سے یقیناً آثارِ قدیمہ کا تقدس مجروح ہوا ہے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از بعثت اور نبوت کے اعلان کے بعد تبلیغ کے سلسلے میں جو مصائب برداشت کئے اور دورِ رسالت کے اہم واقعات محض کتابوں کے ورقوں میں رہ جائیں گے اور وہ شعائر و شواہد جو یکے بعد دیگرے مٹائے جا رہے ہیں نظروں سے محو ہو جائیں گے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر سیرت نگاروں کے علاوہ مسلمان دانشوروں اور مسلم ممالک کے حکمرانوں اور با اثر لوگوں کو غور و فکر کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں بہت سے ایسے مقامات کی نشاندہی کرا سکتا ہوں جن کے آثار مٹائے جا چکے ہیں اور اب وہاں پر ایسی تعمیرات وجود میں آ چکی ہیں جن کی ماضی کے واقعات سے کوئی نسبت نہیں۔

جناب صلاح الدین محمود نے اپنے سفرنامہ حجاز بعنوان 'نقشِ اوّل کی تلاش' میں لکھا ہے کہ ترکوں نے حجاز پہ اپنے دورِ حکومت کے دوران، رسولِ اکرم کی ولادت سے لے کر آپ کے وصال تک ہر لمحہ سے وابستہ ہر جسمانی، روحانی، تاریخی اور جمالیاتی کیفیت کو آنے والی نسلوں کے تاریخی، جمالیاتی اور ایمانی شعور کے واسطے، درستگی اور سادگی کے ساتھ محفوظ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ کام ایک غیر شعوری سطح پر تو عہدِ نبوی ہی سے جاری تھا مگر اب کوئی ایک ہزار برس گزر چکے تھے اور اب یہ ضروری تھا کہ ایک شعوری اور حتمی سطح پر یہ عمل ہو۔ اس کام کے واسطے جنون کی حد تک رسولِ کریمؐ سے محبت اور انسانی حواس کی حدود تک نفاست اور ذہنی سچائی کی ضرورت تھی۔ یہ رحمت ترک ذہن میں موجود تھی اور اس واسطے وہ اس کام میں تقریباً مکمل کامیاب ہوئے تھے۔ ترکوں کا

انسانیت پر یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

پھر کئی صدیاں بیت گئیں۔ اندرونی سازشوں اور بیرونی نیتوں کے دباؤ کے تحت پرانی حکومتیں کمزور اور نئی حکومتیں مزید طاقت ور ہو کر ظہور میں آتی رہیں۔ پھر جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ اس جنگ میں عثمانی حکومت نے انگریز، فرانسیسی اور اطالوی طاقتوں کے خلاف جرمن قوم کا ساتھ دیا۔ ۱۹۱۸ء میں 'ترک جرمن محاذ' کو شکست ہوئی اور فتح پانے والے 'اتحادیوں' نے جہاں جرمنی کے ٹکڑے کر کے شکست کے ساتھ ساتھ اس کے اجتماعی وقار کو خاک میں ملا دیا وہاں ترکمانی ناموس بھی خون کے ساتھ ساتھ بہہ کر خاک میں شامل ہو گیا اور عثمانی حکومت کی کشادہ حدود بھی خارج ٹولے کے تصرف میں آ گئیں۔

عالمی جنگ کے اختتام پر ہی ترکوں نے حجاز کا نظام وہاں کے سربراہ قبیلے کے سردار کے سپرد کر کے اپنی فوجیں حجاز سے واپس بلا لی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ میں شکست کے بعد وہ حجاز میں اپنی حکومت صرف فوجی طاقت کے ذریعے قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کسی حملے کی صورت میں خاکِ حجاز پر لہو بہانا لازم ہو جائے گا اور خدانخواستہ مکے اور مدینے میں گولی چلانی لازمی ہو جائے گی۔ یہ کیفیت ترک لحن و خصلت کے بالکل برعکس تھی۔ سو کچھ عرصے سوچ و بچار کے بعد حجاز کے ترک گورنر کے حکم پر ترکوں نے خانہ کعبہ کے گرد آخری طواف کر کے مسجدِ نبوی کی دہلیز کو آخری بار چوما اور خاکِ حجاز سے ہمیشہ کے واسطے چلے گئے۔

حجاز پر قبضہ جمانے کے فوراً بعد ہی حجاز کے طول و عرض سے رسولِ پاکؐ کے نام کو محو کرنے کے کام کی ابتدا ہوئی۔ مسجدِ نبوی، خانہ کعبہ کی مسجد اور اس کے علاوہ جہاں جہاں اور جس جس عمارت اور مسجد پر محمدؐ کا نام نہایت ہی فن اور محبت سے جاگزیں تھا اس کو نہایت ہی بھونڈے پن سے مٹا دیا گیا۔ ایمان، محبت اور فنِ خطاطی اور دیگر فنونِ لطیفہ کے ان نادر نمونوں پر کہیں تو کولتار پھیر دیا گیا اور کہیں ان پر پلستر تھوپ دیا گیا۔ اکثر اوقات لوہے کی چھینی اور ہتھوڑے کا استعمال بھی کیا گیا۔ اس بے مثال گستاخی کے نشانات آج تک حجاز کے طول و عرض میں اور خاص طور پر خانہ کعبہ کی پرانی مسجد اور مسجدِ نبوی کے در و دیوار پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

رسولِ پاک کا نام مٹانے کے بعد حیاتِ طیبہ سے منسلک تقریباً ہر تاریخی جمالیاتی، روحانی، جسمانی اور معاشرتی نشان کو ہدف بنایا گیا۔ جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کے قبرستان کہ جن کی بھربھری خاک میں حضرت عبدالمطلب، حضرت ابوطالب، ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت عباسؓ، حضرت حلیمہ سعدیہؓ اور امہات المومنینؓ، آپ کی صاحبزادیاںؓ، آپ کے صاحبزادگانؓ اور خانوادہ رسولؐ کے دیگر افراد، صحابہ کرامؓ اور ان کے پورے پورے خاندان، مشائخ صوفیائے کرام، نامورانِ اسلام اور دو جہانوں کی چار سمتوں سے محبت اور ایمان کی خاطر آئے ہوئے ان گنت گمنام مسلمان سکون اور شائستگی سے رہتے تھے، لوہے کے مشینی ہل چلا کر کھود ڈالے گئے اور پھر پٹیلا پھروا کر برابر کروا دیئے گئے۔ بعد میں جنت البقیع کے سامنے سڑک کے پار شہدائے کرام کے مزار سڑک کو چوڑا کروانے کی نذر ہوئے اور حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کے مزار اور تابوت کو

ایک بازار کی توسیع کے دوران راتوں رات غائب کروا دیا گیا۔ نہ ابو طالب کا محلہ رہا نہ ورقہ بن نوفل کی دہلیز، نہ ام ہانی کا آنگن رہا اور نہ ہی بنو ارقم کی بیٹھک کی کوئی چیز۔ اس ٹیلے پر کہ جہاں حضرت ابو طالب کا محل تھا ایک بدصورتی کی حد تک جدید متعدد منزلوں کی عمارت کھڑی ہے۔ ورقہ بن نوفل کا مکان ایک کپڑے کے بازار کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ دار ارقم کی جگہ کرائے کی موٹر گاڑیوں کا اڈہ ہے اور رہا ام ہانی کا گھر کہ جس کے آنگن میں دو اوقات مل کر ایک ہوئے تھے تو وہ مسجد حرام کی توسیع کے دوران مٹ کر بے نشان ہو چکا ہے۔

جب حضرت عبدالمطلب کی قبر ہی نہ رہی تو اس تک جانے کا وہ راستہ بھی نہ رہا کہ جس پر نو برس کا ایک بچہ آخری بار ٹھک کر رو دیا تھا اور نہ ہی وہ پگڈنڈی رہی کہ جس پر ایک ضعیف انسان اپنی چادر میں ایک نوزائیدہ بچے کو لپیٹ کر لے چلا تھا۔ ہاں اس بے وضع عمارت کے سائے میں کہ جو ابو طالب کے محلے کو کھود کر بنائی گئی ہے اس گھر اور اس کا وہ شمالی کمرہ کہ جس میں چہار آئینوں کی اوٹ میں کبھی چہار سمتیں ملی تھیں ابھی تک بمشکل موجود ہے مگر اس کمرے میں عرصے سے سفیدی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی تیسرے چاند کے بارھویں دن معصوم بچے تلاوت کرنے اس گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کمرے کے شمالی جانب ایک روشن دان ضرور موجود ہے مگر اس سے اب آپ شمال کا ستارہ نہیں دیکھ سکتے کہ متعدد منزلوں کی وہ بدوضع عمارت کہ جو شاید کہیں اور نہ بن سکتی تھی راستے میں حائل ہے اور رہے پرندے تو ان کے آزاد کرنے کا رواج تو اس شہر میں کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔

اگر آپ اس گھر میں کہ جس میں رحمۃ للعالمینؐ کا ظہور ہوا تھا دو نفل شکرانے

کے ادا کرنے چاہیں تو ایک ہنٹر بردار آپ کو روک کر کہہ دے گا کہ یہ شرک ہے۔

حضرت خدیجہؓ کے گھر اور اس کمرے کے بارے میں بھی سُن لیجئے کہ جہاں اعتماد کا ایک بنیادی لمحہ بھی گزرا تھا۔ وہ کمرہ اور وہ گھر بھی نصف صدی سے حافظِ قرآن رنگ سازوں کا انتظار کرتے کرتے اب ایک صرافہ بازار سے گھر چکے ہیں۔

ہجرت کے راستے کا نشان تک مٹ چکا ہے۔ مکے سے مدینے تک جانے کا نیا راستہ تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ راستہ مکے سے مقام بدر تک سمندر کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور وہی ہے کہ جس سے ابوسفیان لشکرِ اسلام کی روانگی کی خبر سُن کر اپنے قافلے کو بچا کر مکے کی جانب فرار ہو گیا تھا۔

مدینے پہنچتے ہی انسان مسجد قبا کا رُخ کرتا ہے جس کے سامنے والے احاطے میں وہ نہایت قدیم کنواں تھا جس کے پانی نے آپؐ کا رُخِ مبارک دیکھا تھا مگر چند برس ہوئے اس کنوئیں کو بھی پتھر کی بڑی بڑی سلیں رکھ کر بند کیا جا چکا ہے۔ استفسار پر نہایت ہی ترش لہجے میں کہا جاتا ہے کہ مشینی پمپ ایجاد ہو چکے ہیں اس واسطے اب اس کنوئیں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

جب شکست و ریخت کا یہ وحشتناک عمل شروع ہوا تھا تو ترکوں کی بنائی ہوئی گنبدِ خضرا والی مسجد نبوی کو گنبدِ خضرا سمیت منہدم کرنے کا اعلان ہوا تھا پھر بہت بڑی بڑی اور اپنے وقتوں کی طاقتور ترین مشینیں منگوائی گئی تھیں۔ اور پھر ایک نکڑ کے ستون سے شروعات کی گئی تھی۔ دو ماہ تک یہ مشینیں اپنی پوری طاقت سے اس ایک ستون سے ٹکرا ٹکرا کر اس کو گرانے یا توڑنے کی کوشش کرتی رہی تھیں مگر یہ ستون ذرہ برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا تھا۔ اس کی جڑوں کو تو با وضو اور حافظِ قرآن ہنرمندوں کے ایمان عشق اور نیت کے سیسے نے تھاما ہوا

تھا یہ کیسے اپنی جگہ سے ہلتا جب طاقتور ترین مشینوں کی دو ماہ تک مسلسل کوشش کے باوجود ایک ستون بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا تھا تو مسجدِ نبوی کو منہدم کرنے کی یہ وحشت ناک کوشش طوعاً و کرہاً روک دی گئی تھی مسجدِ نبوی کے اس ستون پر اس عمل کے نشانات آج تک موجود ہیں۔ (روایت لاہور، شمارہ اول ۱۹۸۳ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو مرتب کرتے ہوئے اقبال احمد صدیقی صاحب نے محض ایک ہی موضوع پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے جو ان کی کتاب کا عنوان ہے اور اس ضمن میں یقیناً ان کی محنت قابلِ داد اور عقیدت و محبت قابلِ رشک ہے۔

اقبال احمد صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات جولائی ۱۹۵۹ء میں بھاولپور میں ہوئی جہاں وہ روزنامہ رہبر کے مدیر تھے۔ وہ منجھے ہوئے صحافی اور کہنہ مشق ادیب کی حیثیت سے مشہور تھے۔ انہوں نے زندگی کے بہت سے رُخ دیکھے اور صحافت کے علاوہ اور بہت سے شعبہ ہائے زندگی سے منسلک رہے۔ اب صحافت کی ۳۰ سالہ کوچہ گردیوں کے بعد ان کی قلبی واردات کے اس مرقع سے دورِ رفتہ کی وارفتگیوں کی تلافی تو ہو سکے گی لیکن میری حالت امیر مینائی کی زبانی یہ ہے کہ ؎

جب مدینہ کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے وہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

(ادارہ ابلاغ علوم و افکار ملی، کراچی کے زیرِ اہتمام جناب اقبال احمد صدیقی کی کتاب 'مدینہ منورہ کی عظمت و محبوبیت' کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر ۲۵ ستمبر ۱۹۸۶ء کو پڑھا گیا۔)

سیاحتِ ممالکِ اسلامیہ

سیاحتِ ممالکِ اسلامیہ، نواب بہادر یار جنگ کا وہ تاریخی روزنامچہ ہے جو انہوں نے ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء سے ۲ نومبر ۱۹۳۱ء تک بلادِ اسلامیہ کے طویل سفر کے دوران لکھا۔ یہ کتاب پہلے بھی شائع ہو چکی ہے لیکن اس کا موجودہ ایڈیشن فنِ طباعت کی خوبیوں اور متعلقہ تصاویر کی وجہ سے اور محترم شاہد حسین رزاقی کی عالمانہ تدوین کے باعث ایک شاہکار کتاب کی صورت میں بہادر یار جنگ اکادمی (کراچی) نے شائع کیا ہے۔

نواب بہادر یار جنگ نے اپنے اس تاریخی سفرِ سیاحت کے متعلق مقدمے میں لکھا ہے کہ

"سیرت النبی کے بعد میں نے سفرناموں کا مطالعہ کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر لڑکپن ہی سے سیر و سیاحت کا شوق اور دنیا دیکھنے کی تمنا دامن گیر ہوئی۔ میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کو حیدر آباد (دکن) سے روانہ ہوا اور سات مہینے کے طویل سفر کے بعد ۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو وطن واپس پہنچا۔ میرے لئے یہ سفر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور میں نے چند خاص مقاصد کے لئے اس قدر طویل سیاحت کا پروگرام بنایا تھا۔ میرا اولین مقصد تو فریضۂ حج ادا کرنا تھا۔ دوسرے، جنگِ عظیم کے پیدا

ممالک سے جب موازنہ کریں تو اپنے ملک کو کئی لحاظ سے بہتر سطح پر پائیں گے۔ اخلاقی اقدار کے حوالے سے، باہمی اخوت ہمدردی و محبت کے انسانی جذبے کی نسبت سے، روزمرہ کی ضرورت کی اشیا کی فراوانی اور مقابلتاً کم قیمت کی وجہ سے اور اپنی دھرتی کی خصوصی بود و باش کی بنا پر۔

"بیرونِ ملک سفر دلچسپ اور قابلِ برداشت اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کو ہم خیال و ہم طبیعت ہمسفر میسّر ہوں جن کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہو، چھوٹے موٹے کام میں ایک دوسرے سے مدد لی جاسکتی ہو، تنہائی کی اذیت سے نجات ملتی ہو۔ بے تکلفانہ بات چیت سے زبان کی آلی اتر جائے۔ اگر اکیلے ہوں تو سخت بوریت ہوگی اور اردگرد کی رنگینیوں، خوبصورتی، چہل پہل اور قدرتی مناظر سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہوسکیں گے۔ پھر بعض اوقات زبان ایک بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔ سفر میں ہمارا خصوصی مسئلہ کھانے پینے کی عادات ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہمارے بعض دوست ہر قسم کے مشروبات اور انواع و اقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس معاملے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے ہیں"۔
(سفر آخر سفر ہے، مطبوعہ ہفت روزہ 'ہلال' راولپنڈی، ۳-۱۰ جنوری ۱۹۸۹ء)

اس معاملے میں نواب صاحب خوش قسمت تھے۔ انہیں عالم فاضل، ہم وطن اور صاحبِ کردار حضرات کی رفاقت میسّر رہی۔ انہیں عربی اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے بلادِ اسلامیہ میں زبان کا کوئی مسئلہ درپیش

کئے ہوئے انقلابی حالات میں، جن کا اسلامی دنیا پر زبردست اثر پڑا تھا۔ مختلف اسلامی ممالک کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تمدنی حالات اور دینی و فکری رجحانات کا براہ راست مشاہدہ و مطالعہ کرنا، اور تیسرے یہ معلوم کرنا کہ خود اسلامی ممالک کے مسلمانوں میں اسلامی اتحاد و اخوت کا جذبہ کس حد تک موجود ہے اور اس کے فروغ و استحکام کے امکانات کہاں تک ہیں۔ چنانچہ میں اس سلسلہ میں ممالکِ اسلامیہ کے اکابر سے جن میں حکمران، قومی رہنما اور سربرآوردہ علماء سب ہی شامل ہیں۔ ملاقات اور تبادلہ خیال کر کے ان کا نقطۂ نظر معلوم کرنا ضروری سمجھتا تھا تاکہ تمام حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اتحاد و اخوتِ اسلامی کو فروغ دینے کی موثر تدابیر اختیار کی جاسکیں"۔

میجر جنرل قمر علی مرزا نے لکھا ہے کہ "بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملک ملک کی سیر کرنا بڑی عیاشی ہے۔ اخلاقی حدود کے اندر رہ کر عیاشی کسی حد تک ضرور ہے۔ شروع شروع میں بیرونِ ملک سفر کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ نئی نئی جگہیں، نئے نئے لوگ دیکھتے ہیں۔ ان کی بود و باش اور معیارِ زندگی کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو جِلا ملتی ہے۔ بین الاقوامی اجتماعات میں وطنِ عزیز کی نمائندگی یا ترجمانی کرنے میں اطمینان اور فخر محسوس ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور ذہن کو متاثر کرتا ہے لیکن اس قسم کے سفر سے جب بھی اپنے وطن واپس آئیں اپنی سرزمین کو چومنے کو جی چاہتا ہے۔ دوسرے

نہیں آیا اور بقول حضرت رومیؔ "ہم زبانی" کی وجہ سے "ہم دلی" کے احساسات و جذبات سے ان کی مختلف مقامات پر پذیرائی ہوتی رہی۔ البتہ مذہبی اور مہذب فطرت کی وجہ سے انہیں خوراک کا مسئلہ درپیش رہا۔ علاوہ ازیں کبھی کبھار طبع کی ناسازی اور آرام میں خلل پڑ جانے کی بھی شکایت رہی۔

یہ روزنامچہ وقائع نویسی کی طرز پہ تاریخی واقعات اور روزمرہ حوادث پر مشتمل ہے۔ گویا ایک صحیفہ ہے مگر اس قدر دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے کہ قاری کو سفرنامہ پڑھنے کا لطف آجاتا ہے۔
نواب صاحب نے نہ صرف اہم اور قابلِ دید مقامات کی سیر کی بلکہ وہاں کے حالات کا غائر مطالعہ بھی کیا۔ اتحادِ عالم اسلامی کے زبردست حامی کی حیثیت میں انہوں نے ایک نئے انقلابی دور میں مسلم اقوام کے حالات کا عینی مشاہدہ کر کے یہ معلوم کیا کہ سلطنت عثمانیہ کی شکست و ریخت اور خلافت اسلامیہ کے خاتمے کے بعد مسلم اقوام کے درمیان روابط کی کیا نوعیت تھی اور مغربی تصور قومیت کی ہمہ گیر مقبولیت کے دور میں اسلامی اتحاد کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے کیا امکانات تھے۔
معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب اپنے روزنامچے کی مدد سے ایک مفصل سفرنامہ لکھنا چاہتے تھے تاکہ اپنے نظریات اور تصورات کو عملی جامہ پہنا سکیں مگر ان کی گوناگوں مصروفیات، برصغیر میں سیاسی سرگرمیوں اور ریاست میں انتظامی سازشوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔

اس کتاب میں شامل ضمیموں مثلاً خطوط، اخباری رپورٹوں، تقاریر اور ملاقاتوں کی روداد کے متن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے تاثرات سے تو اس کی سند ملتی ہے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ "تمام دنیا کے موجودہ مسلمانوں میں کسی مسلمان نے ایسا جامع اور وسیع سفر اس زمانے میں نہیں کیا۔ اگر بہادر یار جنگ اپنے سفرنامے کو ویسا ہی لکھ سکیں جیسا کہ وہ بولتے ہیں اور جیسا کہ انہوں نے گہری نظر سے سیاحت کی ہے تو ان کا سفرنامہ اردو زبان کے سب سفرناموں سے بڑھ جائے گا اور اسلامی دنیا کے سب ممالک کا آئینہ سمجھا جائے گا۔"
روزنامچے کے مطالعہ سے ہمیں بعض ایسے مسائل سے بھی آگہی ہوتی ہے جن کے بارے میں نواب صاحب نے مختلف علما و اکابر سے تبادلہ خیال کیا اور جو صدیوں سے ہماری تاریخ میں نہ صرف باہمی رنجش کا سبب بنے رہے بلکہ ہمارے عروج و زوال کے بھی باعث بنے۔ مثلاً قدیم تہذیب و تمدن کی قدروں کی پسپائی، ناخواندگی، عوام کا استحصال، مذہبی عدم رواداری، اجتہاد کا مسئلہ، پردہ اور تعدد ازدواج، ارتکاز دولت، نجی املاک، مساواتِ محمدی کی عملی تفسیر، اتحاد بین المسلمین وغیرہ مختلف مذہبی مسالک کے موجب ان مسائل کی تفسیر اور ان کے حل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم موجودہ صدی کے تیسرے عشرے میں جب ایک طرف اقوامِ فرنگ کی سامراجی سازشوں، سیاسی ریشہ دوانیوں، ثقافتی یلغار اور صنعتی و سائنسی ترقی کے نتیجے میں ممالکِ محروسہ اور پسماندہ علاقوں میں

ان کا اقتصادی غلبہ اور عسکری بالادستی مستحکم ہو رہی تھی تو دوسری طرف شکست خوردہ اور محکوم ممالک میں دوسری عالمگیر جنگ کے لئے لاوا پک رہا تھا۔ یہ استعماری طاقتوں کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی حکمتِ عملی کا ردِ عمل تھا۔ ایسے پُر آشوب دور میں بھی ہم خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوئے اور ظاہر پرستی کے غلاف میں چھپے رہنے میں عافیت سمجھتے رہے۔

قائدِ ملت نے سیاحتِ بیروت و فلسطین کے باب میں ۱۰ محرم ۱۳۵۰ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۳۱ء کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ "آج یومِ عاشورہ ہے۔ ہمارے جہاز پر عراق، ایران اور خراسان کے بہت سے شیعہ سفر کر رہے ہیں۔ نیچے ایک چھوٹے سے پھاٹک میں انہوں نے مجلسِ عزا گرم کی۔ خوب دھڑا دھڑ ماتم ہو رہا ہے اور آہ و بُکا برپا ہے، وہ اس کو اظہارِ محبت سمجھتے ہیں۔ حضرت امام علیہ السلام اور شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی شہادت سے مسلمانوں کے لئے ثباتِ قدم، ایثار فی سبیل اللہ، صبر و استقامت علی الدین کا ایک عظیم الشان اور فقید المثال اُسوہ پیش کیا۔ ان کی محبت کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ہم اپنے اندر اُن اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ سینہ کوبی اور جامہ دری نقصانِ مایہ کے علاوہ شماتتِ ہمسایہ بھی ہے۔ مغرب اقصیٰ اور شام کے مسلمان اس طریقۂ ماتم کو دیکھ دیکھ کر حیران تھے اور 'حرام' 'حرام' 'کفر' 'کفر' کہتے ہوئے واپس ہو جاتے تھے۔"

آج کل کے حالات بھی نصف صدی پہلے کے حالات سے مختلف

نہیں؟ ہم نے کب تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کیا ہے؟ وطنِ عزیز میں مذہبی رواداری کا کیا عالم ہے؟

خامۂ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

جنگِ عظیم اول میں توپوں کی گرج نے جب خوابیدہ مشرقی اقوام کو جگایا تو وہ مغرب کی طرف دوڑ پڑیں اور مغربی ممالک کی ظاہری شان و شوکت نے ان کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ وہ ان کی حیران کن ترقی سے مسحور ہو گئیں، لیکن یہ نہ جان سکیں کہ اس حیرت انگیز ترقی کا راز سائنس اور علوم و فنون کی ترقی میں مضمر ہے اور نہ مغربی اقوام کے لباس، وضع قطع اور طرزِ معاشرت ہی کو ترقی کا راز سمجھ کر ان کی کورانہ تقلید کرنے لگیں۔ چنانچہ انہوں نے مغرب کی سائنسی، اقتصادی، صنعتی اور علمی ترقیوں کو اختیار کرنے کے بجائے صرف مغربی وضع قطع کو اختیار کر لینا کافی سمجھا اور حقیقی ترقی کی منزل سے بدستور بہت دور رہیں۔

خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد عالمِ اسلام کا منظر روح فرسا تھا۔ شکست و ہزیمت کے علاوہ، فاتح اتحادی دول نے بلادِ عربیہ کو کئی ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور اسی طرح قائم ہونے والی عرب اقوام، انگریزوں اور فرانسیسیوں کی محکوم بن گئیں۔ ان ممالک پر مغرب کی سیاسی اقتصادی اور عسکری گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ تمدنی اور فکری اثرات بھی روز افزوں تھے اور اس سے مذہب بھی متاثر ہوا۔ علاوہ ازیں یورپی

عیسائی عورتوں سے شادیاں کرنے سے، ان عورتوں کے بہت گہرے اثرات کا ان کی اولاد پر پڑنا ناگزیر تھا۔ اسی طرح یورپ میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان نوجوانوں نے اپنے استادوں سے یہ سیکھا کہ قوم کی ترقی و استحکام کا ذریعہ سیاسی و اقتصادی ترقی ہے جو سیاست اور معیشت کو مذہب سے علیحدہ رکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مذہب کو انسان کی صرف روحانی زندگی تک محدود کر دینا اور اسلامیت کی جگہ قومیت کو فروغ دینا لازمی ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی تعلیم یافتہ مسلمان عموماً مذہب سے بے نیاز ہو گئے۔ مغربی افکار کی اشاعت کی وجہ سے ایک لادینی طبقہ بھی پیدا ہو گیا اور ملتِ اسلامیہ زوال پذیر ہو گئی۔

ایک خط میں اُن کے جذبات کی شدت اور خلوص ملاحظہ کیجئے۔

"قسطنطنیہ، ١٩ جولائی، ١٩٣١ء۔ مصر سے قدس واپس آیا۔ دو روز رہ کر لبنان کی پہاڑیوں پر چڑھ گیا اور وہاں قدرت کی گل کاریوں کے نظارے دیکھے۔ پھر دمشق آیا۔ سلاطین بنی اُمیہ کا پایہ تخت، انبیا علیہم السلام کا مسکن، صحابۂ رسول کا میدانِ جنگ، قتلِ حسین کے منصوبوں کا مرکز، وہ جگہ جہاں پہنچکر خلافتِ رسول سلطنت سے بدل گئی۔

"مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ راجدھانی پر فرانسیسیوں کا غلبہ دیکھ کر دوڑے ہوئے سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر پہ گئے اور رو رو کر پوچھا کہ کیا یہی زمین ہے جس کے لئے تم نے خون کی ندیاں بہائی تھیں؟ سارے یورپ کے متفقہ سیلاب کا انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کی متحدہ فوجوں

کا تن تنہا مقابلہ کیا تھا؟ کیا یہ اعتقاد غلط ہے کہ روحیں سنتی اور جانتی ہیں، تو کیا بیت المقدس کو یہودیوں کا وطن اور شام کو فرانسیسیوں کی آماجگاہ دیکھ کر عرش کے کنگرے نہیں ہلا سکتیں؟ کانوں نے کچھ سننا شروع کیا۔ قلب نے کچھ محسوس کیا۔ آواز شاید یہی تھی کہ بیوقوف، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد۔ ١١)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس دور کے دوسرے زعمائے ملت کی طرح نواب بہادر یار جنگ بھی اسلامی نظام حیات کی تجدید کے سرگرم داعی تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے دو مرحلوں کا تعین کیا تھا۔ ایک ذہنی انقلاب اور دوسرے اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ۔ پہلے مرحلے کے لئے ضروری ہے کہ نظام تعلیم کی بنیاد کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر ہو تاکہ بچوں کی صحیح معنوں میں علمی اور ذہنی سطح پر تربیت ہو سکے اور اسی طرح ہی مثبت اور صحت مند خطوط پر اسلامی نظامِ حیات کی منزل تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ہمارے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ زندگی کے ہر شعبے مثلاً سیاسی و معاشی نظام اخلاق و عادات اور تہذیب و ثقافت کو اسلامی اصولوں سے مطابقت میں لاسکیں، ذہن و فکر اور قول و عمل کی اس ناپاکی کو دور کر سکیں جو انسان و انسانیت کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔

نصف صدی پہلے کی اس صدائے سرمدی کی بازگشت آج بھی فضا

میں گونج رہی ہے۔ اگر ہماری سمع و بصر کی قوتیں زائل نہیں ہوئی ہیں، تو ہمیں صراطِ مستقیم پر سُرعت سے گامزن ہو جانا چاہیئے۔

روزنامچے میں بطور ضمیمہ نواب بہادر یار جنگ کی وہ پُر مغز تقریر بھی شامل ہے جو انہوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۳۲ کو عریبک کالج، اجمیری دروازہ، دلی میں منعقدہ ایک بڑے جلسے میں زیر صدارت سر محمد یعقوب کی تھی اور جس میں بلادِ اسلامیہ کی طویل سیاحت کے دوران اپنے ذاتی معلومات، مشاہدات و تجربات اور تاثرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، پُر خلوص درد مندی اور فکر مندی سے بیان کیا کہ ایشیائی ممالک اور بالخصوص عالمِ اسلام، تاریخ کے ایک نہایت اہم اور نازک دور میں کس راہ پر سفر کر رہے ہیں۔ بلادِ اسلامیہ کن حالات سے گزر رہے ہیں اور ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ تقریر گویا ان کے روزنامچے کا ماحصل ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں سفر نامہ لکھنے کی فرصت ملتی تو نہ صرف ایشیائی ممالک اور بالخصوص اسلامی دنیا کے مسائل تفصیل سے اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ہمارے سامنے آتے بلکہ ان کی فکری فراوانی کے ذریعے ان مسائل کو سلیقہ مندی سے سلجھانے اور مثبت انداز میں منصوبہ بندی سے آزادی اور خوشحالی کی راہیں کھل جاتیں اور کامیابی اور کامرانی کی منزل قریب تر ہو جاتی۔

تقریر کے اختتام پر انہوں نے تین قسم کے جراثیم کا ذکر کیا جو اقوامِ فرنگ کے اکابر اور دانشوروں کی جانب سے ایشیائی دماغوں میں چھوڑے گئے مثلاً یہ تخیل کہ مذہب مانع ترقی ہے (ب) وحدتِ اسلامیہ کے بجائے

قومیت پرستی کا تخیل اور اس کے ذریعہ آپس میں تفریق پیدا کرنا اور (ج) گراں خرچ مغربی تمدن و معاشرت و بلند تر معیارِ زندگی کو مفلس و غریب ایشیا کے کندھوں پر لادنا۔

نواب صاحب کا کہنا تھا کہ " مذہب مانع ترقی نہیں ہے کیونکہ عہدِ قدیم سے روحانیت اور مذہب پرستی ایشیائی اقوام کی خصوصیات رہی ہیں اور مسلمانوں کی تاریخی اور درخشندہ کامیابیاں دینِ اسلام ہی کی رہینِ منت تھیں " چنانچہ نواب صاحب نے کہا کہ " علمائے دین ابھی حال میں مست اور اس خطرے سے بے خبر ہیں اور نوجوان عظمتِ مغرب کو چوندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر اس شر کو اپنے لئے خیر سمجھ رہے ہیں وقت ہے کہ ہم بیدار ہو جائیں۔ اپنے دین کا قرآنِ مجید کی روشنی میں مطالعہ کریں اور سوچیں کہ کیا فی الحقیقت ہمارا دین بھی مانع ترقی ہے؟ اگر نہیں ہے، بلکہ مؤیدِ ارتقا ہے تو یورپ کو سنا دیں کہ تیرا نظریہ اپنے مذہب کے پیشِ نظر درست لیکن اسلام کی موجودگی میں غلط ہے۔ اگر تزکیۂ نفس اور سیاستِ مدن کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہتا ہے تو آ اور دامنِ اسلام میں پناہ گیر ہو، پھر دیکھ کہ مذہب ہی نے سامانِ ترقی پیدا کئے تھے اور اب بھی کر سکتا ہے "

اسی طرح نواب صاحب نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا کہ بیرونِ ہند کی مسلمان اُمت سے رشتۂ اخوت برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کی دوسری اقوام کے ساتھ ربط و ضبط قائم رکھیں۔ اُن کے نزدیک پہلے بھی مسلمانوں

کی ترقی کا راز اجتماعیتِ اسلامیہ تھا اور آج بھی ہے۔

تیسرا مسئلہ مغرب کی اندھی تقلید ہے جس پر نواب صاحب نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "جنگِ عظیم کے ہنگامۂ رستخیز نے جب ایشیا کو اپنی گراں خوابی سے بیدار کیا تو ان برسوں سے سوئے ہوؤں نے آنکھوں کو ملے بغیر اس سمت میں نظر ڈالی جدھر سے یہ مہیب آوازیں آ رہی تھیں اور پردۂ آتش و دُخاں کو چاک کر کے جب یورپ کو دیکھا تو عجیب عالمِ عظمت و جلال نظر آیا۔ جس چیز پر نظر پڑ جاتی تھی کرشمۂ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است۔ اس صدیوں کے پابہ زنجیر غلام نے اپنے آقا کے گھر کی یہ رونق دیکھی تو تمدن و تہذیب مغرب کی ترقی کے ان نتائج کو سببِ ارتقا سمجھا اور حقیقی اسباب سے قطعِ نظر کر کے خود بھی ظاہر میں وہی بننے کی کوشش کی جو یورپ سالہا سال کے بعد بن سکا۔ اپنی جیب کے وزن کا اندازہ کئے بغیر معیارِ زندگی کو بلند کرنے لگا۔ اپنی موافق حالات اور سادہ معاشرت اس کو ذلیل نظر آنے لگی اور اس کی ما بہ الاحتیاج کے لئے بھی ناکافی معمولی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے کمروں کی سجاوٹ، اپنے مکان کی آرائش اور اپنے جسم کی زینت پر صرف ہونے لگا۔ اس کے عمل کی قوتیں اسبابِ ترقی کو تلاش کرنے اور حاصل کرنے کے بجائے نتائجِ ارتقائے تہذیب کو حاصل کرنے میں صرف ہونے لگیں۔ اس کے دو بُرے نتائج مرتب ہوئے۔ ایک یہ کہ دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے مشرق اپنی چھوٹی سے

چھوٹی ضرورت کے لئے ان ہی کا محتاج ہو گیا۔ دوسرے، آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی نے اس کو بے انتہا مالی مشکلات کا شکار بنا دیا۔ آج وہ بظاہر مہذب، ممالکِ مغربیہ کی سی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن کیا ہم اس سے پوچھیں کہ اس کا دل مطمئن بھی ہے؟ مجھے اپنی اس سیاحت کے تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مشرق کے فی صدی بچانوے مغرب پرست فرزندوں کو میں نے قرض کی زنجیر میں گرفتار پایا۔

"یہ امر مسلمات سے ہے کہ ہر تخریب اپنے بعد ایک تعمیر کی بنیاد ہوتی ہے اور خرابی ایک تجربۂ ناخوشگوار کے بعد سامانِ بیداری فراہم کر دیتی ہے، لیکن بعض بیمار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نقاہت و ناتوانی مزید اضافہ قرض کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ایشیا ایک ایسا ہی بیمار ہے، اس لئے یہ کہہ دینا کہ وقت خود بخود علاج کر لے گا، میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ایشیائی اقوام اس خطرے کو محسوس کریں اور جلد سے جلد آمدنی اور خرچ میں توازن قائم کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔"

مندرجہ بالا تجزیہ سن کر خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "میں نے دل میں خدا سے دعا کی کہ وہ مجھ کو توفیق دے کہ میں ہندوستانی مسلمانوں کو نئے تمدن کی فضول خرچیوں سے بچانے کی کامیاب کوشش کر سکوں۔ کیوں کہ یہاں بھی یہ وبا پھیل گئی ہے اور ہندوستانی مسلمان کفایت شعاری کے قدیمی تمدن کو ترک اور فضول خرچی کا نیا تمدن اختیار کر رہے ہیں اور اپنی آمدنی سے خرچ کو زیادہ بڑھا لیا ہے۔"

سگران کو اب تک اپنے انجام کا فکر پیدا نہیں ہوا ہے۔ اگر میں نواب صاحب کے سفر کے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے کوئی کام کرسکوں اور خود نواب صاحب حیدرآبادی امراء اور غرباء کو نئے تمدن کے اسراف سے محفوظ کرسکیں تو یہ اتنا بڑا کام ہوگا کہ ان کی سیاحت کی تکلیف ان کے لئے اور ان کے ذریعے میرے لئے دونوں جہاں کی راحت و مسرت اور اطمینان کا باعث ہو جائے گی۔"

ہم کو بخوبی علم ہے کہ نواب محمد بہادر خان کے قول و عمل پر علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ کا بھی گہرا اثر تھا۔ "سیاحت ممالک اسلامیہ" کے مطالعے کے بعد مجھے اقبال کے ایک شعر میں حاصل مطالعہ کی جھلکیاں نظر آئیں ۔

در عجم گردیدم و در عرب
مصطفیٰ نایاب، ارزاں بولہب

(ترجمہ) میں نے عرب اور عجم گھوم لیا۔ بولہب عام ہے مصطفیٰ نایاب ہے۔

فضل حق صاحب نے اس شعر کے حوالے سے عصر نو کی رزم حق و باطل کے بارے میں "گاہے گاہے باز خواں" کالم (جنگ، کراچی یکم دسمبر ۱۹۸۸ء) میں لکھا ہے کہ دل لرزتا ہے، قلم لڑکھڑاتا ہے، تاہم سچ کہنا، اعلائے کلمۃ الحق اور امر بالمعروف کا تقاضا ہے۔ یہ تقاضا ہم پر دین کا قرض ہے سچ یہ ہے کہ یہ قرض دنیائے اسلام پر ہے، یہ بہت بڑا قرض ہے۔ یہ وہ قرض ہے جس کے متعلق ہم سب سے روز محشر جناب ختم الرسلؐ کے سامنے پوچھا جائے گا۔ اس شعر کی تہہ میں دو اَن کہی باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ

عرب، جو ہماری ملی زندگی کی مادر گیتی ہے، ابتر حال میں ہے، عجم کا تو خیر حال اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال اس شعر کے ذریعے ایک خطرے کی گھنٹی بجانا چاہتے ہیں، وہ اہل ایمان کو اس خواب گراں سے جگانا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے بولہب، دیار اسلام میں کھلے بندوں پھرتا ہے۔

میں عجم کی بات نہیں کرتا، اس معاملے میں اصل بات یہی ہے عرب کی، کعبہ عرب میں ہے، نبیؐ کی آرامگاہ عرب میں ہے۔ قرآن کی زبان عربی ہے، اگر ہماری نشاۃ ثانیہ ہوگی تو وہ نشاۃ عرب کی کوکھ سے جنم لیگی مولانا روم نے کہا تھا ۔

دست ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

ترجمہ:۔ ہر نا اہل طبیب تمہیں بیمار کرے گا، اپنی "ماں" کی طرف لوٹ کر وہی تمہارا علاج کرے گی۔

حب وطن کے حوالے سے، مختلف زبانوں کی ایک جیسی ترکیبیں، ذہن آدم نے بغیر وجہ کے نہیں تراشی تھیں۔ ہر انقلاب ایک زمین کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ دوسری زمینوں میں پھیل سکتا ہے، لیکن ان اجنبی زمینوں سے وہ اپنی جڑوں کے لئے خوراک اور اپنی شاخوں کے لئے تازگی نہیں لے سکتا۔ انقلاب مصطفیٰؐ جب بھی نئی کروٹ لے گا تو وادی فاران سے اترے گا یا فاران جیسے کسی اور صحرا سے، جیسے روح مصطفیٰؐ اپنے کرم سے انتخاب فرمائے،

روحِ مصطفےٰ روحِ ابد ہے۔

نواب بہادر یار جنگ کے روزنامچہ کے مطالعہ سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ نصف صدی پہلے اسلامی دنیا کے کیا حالات تھے۔ اس صورتحال کا موجودہ دور سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ماتمی شعر سے اب تک، ایک زوال کی لہر تھی۔ احیائے دین کی تمام کوششیں سطحی، تمام عمل سیاسی، تمام کام کارِ دنیا۔ اخوان المسلمین بنی تو افرنگ کے لئے، بعث پارٹی ابھری تو امریکہ کے لئے۔ یہ سب تحریکیں، سوزِ مصطفیٰ سے خالی تھیں۔ عجم نے کیا کیا؟ پاکستان میں نفاذِ اسلام آیا تو کوڑوں، زنجیروں اور مصنوعی شریعت بلوں کے ساتھ۔ ایران میں شہنشاہی کے خلاف طوفان اٹھا، شہنشاہی دفن ہوگئی۔ لیکن ہائے افسوس! نہ مصطفوی قافلہ آگے بڑھا، نہ بولہبی پر ضرب پڑی۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، بیسویں صدی عیسوی میں مسلمان دانشوروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ خودنمائی اور خودپسندی کے مقابلے میں خوداعتمادی اور خودداری کو اعلیٰ اوصاف میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ خوبیاں قومی وقار اور ریاست کے استحکام اور خوشحالی کی ضمانت ہیں۔

پاکستان اب تک دولت کے ارتکاز، افراطِ زر اور اسراف جیسے جان لیوا امراض میں مبتلا ہے، جس کے نتیجے میں نہ صرف شرفِ انسانیت مجروح ہوتا چلا آرہا ہے بلکہ ملک بھیانک قسم کی سماج دشمن سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بے شک جمہوریت اچھا، مقبول اور مروج نظام حکومت ہے لیکن اقتصادی آزادی کے بغیر حق بالغ رائے دہی چہ معنی دارد؟

پاکستان کا قیام ایک انقلاب تھا، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جانب ایک اہم قدم تھا۔ ہماری آرزو تھی کہ یہ ہماری حیاتِ نو ہوگی جہاں خوابیدہ تصورات اسلامی ایک مرتبہ پھر بیدار ہوں گے اور فلاحی معاشرہ کے قیام اور فروغ سے ہم اپنا تاریخی کردار ادا کرسکیں گے۔ افسوس ایسا نہ ہوسکا۔ پاکستان کے جو قائدین بنے انہوں نے کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہِ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہا۔ بہادر یار جنگ کا نظریہ اس سے مختلف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قائد وہ ہے جو بنیاد کا پتھر بن کر اپنے سینے پر عمارت کے قیام اور اس کے استحکام کی ضمانت قبول کرتا ہے۔

بزرگو اور دوستو! بھائیو اور بہنو! غور فرمائیے۔ اکیسویں صدی کے لئے ہم کس طرح کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں؟ ہمارا سابقہ قرطاس ابیض داغدار ہے۔ ماضی سے سبق لے کر مستقبل کے لئے تیاری کرنے میں ہی ہماری عافیت ہے۔ یہ ہی ہوش مندی اور قومی غیرت و حمیت کا تقاضا ہے۔

(قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کے روزنامچہ بعنوان 'سیاحت ممالک اسلامیہ' کی تقریب اجراء میں بتاریخ ۱۰ جنوری ۱۹۸۹ کو پڑھا گیا)

—○◯○—

محترم

[محمد طفیل صاحب اور ان کی مرضی کے مطابق دیر سویر سے شائع ہونے والے ضخامت اور حجم میں یکتا جریدہ 'نقوش' سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ ۱۹۶۶ء میں محکمہ تعلقات عامہ حکومت مغربی پاکستان لاہور میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر پریس برانچ کی حیثیت سے تقرر ہوا جس کی وجہ سے بڑے بڑے جگادری قسم کے ناشروں، کتب فروشوں اور بظاہر مشہور و معروف ادیبوں کے رازہائے دروں سے واقفیت ہوئی۔ طفیل صاحب سے بالمشافہ ملاقاتیں اسی دوران میں ہوئیں، گو میں 'نقوش' کا پرانا قاری تھا اور آزادی کے بعد لاہور سے جاری ہونے والے بہت سے پرانے رسائل کا نہ صرف مطالعہ کیا ہوا تھا بلکہ ادبی اور معاصرانہ چپقلشوں سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ بہرحال میں نے بارہا طفیل صاحب کو آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ علامہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر سے متعلق بھی 'نقوش' کا کوئی خاص نمبر شائع کریں اور اسی طرح شاہ عبداللطیف بھٹائی، خوشحال خان خٹک اور مست توکلی کے بارے میں بھی 'نقوش' کے نمبر شائع ہونے چاہئیں لیکن وہ ہمیشہ ٹالتے رہے۔ کہتے تھے کہ وہ ذہنی طور پر علاقائی تعصبات سے دور ہیں اور "نقوش" کا دامن بھی ایسے رجحانات کے فروغ اور نشر و اشاعت سے پاک ہے۔ لیکن بعد میں انہوں نے 'اقبال نمبر' نکالے جن میں کوئی نئی بات منصۂ شہود پر آ نہ سکی البتہ اس کا شہرہ بہت ہوا۔

نومبر ۱۹۶۶ء میں میرا تبادلہ حیدر آباد ہوا جہاں سے جنوری ۱۹۶۸ء میں 'قومی تعمیر نو' لاہور میں تقرر ہوا۔ ہمارا دفتر اچھرہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے پڑوس میں واقع تھا۔ اسی مہینے میں طفیل صاحب نے اپنا سفر نامہ بعنوان 'محترم' شائع کیا، جس میں جولائی ۱۹۶۳ء میں اپنے دورۂ سندھ بشمول کراچی کی روداد اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں اپنی شرکت کا احوال تحریر کیا تھا۔ 'محترم' کی رونمائی کی تقریب پارک لگزری ہوٹل، لاہور میں ۱۶ جون ۱۹۶۸ء کو زیر صدارت قدرت اللہ شہاب، سکریٹری وزارت تعلیم منعقد ہوئی۔ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض سید قاسم محمود صاحب نے انجام دیئے۔

اس تقریب میں 'محترم' پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں میرا نام بھی شامل تھا جو دعوت ناموں پر چھپا ہوا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ تقریب کے آغاز سے پہلے ہی شہاب صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری نے مجھ سے کہا کہ شہاب صاحب میرا مقالہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے انکار کرنے پر وہ چلے گئے لیکن تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور ترش اور تحکمانہ انداز میں مقالے کا تقاضا کرنے لگے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ادبی محفلوں کے آداب کے خلاف ہے اور میں کسی تعلیمی ادارے کا ملازم بھی نہیں کہ شہاب صاحب کی دھونس میں آؤں، جو پاکستان رائٹرز گلڈ کے ذریعے 'آزادیٔ اظہار' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور اس طرح کی معیوب کارروائی میں بھی ملوث ہو رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ ان حالات میں شہاب صاحب آپ کو مقالہ پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کوئی ۲۰ سال بعد مجھے سید قاسم محمود صاحب

نے بتایا کہ "کسی شخص نے برسرِ محفل مجھے الگ بلا کر کہا تھا کہ طفیل صاحب کریم بخش خالد سے مضمون پڑھوانا نہیں چاہتے اور میں نے اس شخص سے کہا تھا کہ طفیل صاحب کو مناؤ کہ مضمون ضرور پڑھا جائے، کیونکہ نیشنل بک سنٹر کا جلسہ ہے۔ ہماری بدنامی ہوگی"۔

اب جب کہ میں اپنی تحریروں کا مجموعہ شائع کر رہا ہوں تو طفیل صاحب کے دیئے گئے ایک حوالے کے مصداق کہ زرتشت نے کہا تھا "آج کی باتیں کل کی امانت ہیں، ان سب کو اکٹھا کرلو"۔ وہ مقالہ بھی شاملِ اشاعت کر رہا ہوں۔ جناب قدرت اللہ شہاب اور محترم محمد طفیل اس دنیا میں نہیں۔ خدا انہیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازے اور سید قاسم محمود صاحب کو عمر دراز اور بخت بلند عطا کرے۔ ک۔ب۔خ]

اس بار طفیل صاحب کی نظرِ کرم نے سندھ کے علاقے کو محترم بنایا ہے۔ وہاں کے لوگوں، وہاں کی طرزِ زندگی اور وہاں کی جانی پہچانی شخصیتوں سے متعلق پاکستان کے قیام کے بعد پہلی بار، پنجاب کے ایک اردو پسند قلمکار نے حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے اور اس علمی اور ادبی تصنیف میں بعض اچھی، بعض لطیف سی اور بعض رنجیدہ کرنے والی باتیں کہی ہیں۔

میں یوں تو نقوش کا ابتدائی دور ہی سے مطالعہ کرتا رہا ہوں اور اسی مطالعہ کے دوران مجھے بارہا یہ خیال ستاتا رہا کہ اردو زبان، جو کہتے ہیں کہ پاکستان کے مطالبے کا ایک اہم جزو تھی اور اب ہماری دو قومی زبانوں میں سے ایک اہم اور نہایت موقر، وسیع اور وقیع زبان ہے۔ اس کے مطالعے اور تحقیق کے

موضوعات کا دائرہ فقط سرحد کے پار تک کے افراد اور موضوعات تک محدود کیوں ہے؟ کیا یہ وسیع علاقہ جو کہ قدرتی طور پر اور تاریخی شواہد کی بنا پر ایک علیحدہ اور مربوط خطہ تھا اور اب آزاد خود مختار مملکت پاکستان کا مغربی حصہ ہے۔ اس کا اردو زبان اور ادب کے ضمن میں دامن تنگ ہے؟ یا یہ کہ اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں یہاں کے باشندوں نے کبھی کوئی پس و پیش کیا ہے؟ حقیقت میں اس کا جواب نفی میں ہے۔

بہرحال میرے اس خاموش احتجاج کے پس منظر میں طفیل صاحب کی تازہ کتاب 'محترم' میری نظر میں نہایت مبارک اور مستحسن کوشش ہے، اس قومی بیداری اور قومی یکجہتی کی طرف، جو کہ ہم اردو زبان کے ذریعے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

طفیل صاحب جولائی ۱۹۶۳ میں انجمن مصنفین پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے حیدرآباد گئے تھے، جہاں انہوں نے سندھی زبان کے ایک عظیم المرتبت صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے عرس میں شرکت کی تھی اور فاضل وقت میں انہوں نے اپنے رفیقوں کے ساتھ مل کر حیدرآباد شہر کی سیر بھی کی اور اپنے رفقاءِ سفر سے غیر رسمی طور پر بات چیت کے دوران عجیب و غریب اور بعض حالات میں انکشاف پذیر باتیں سنیں اور ان کو اپنے معروف ذہن کے ان دائروں میں محفوظ رکھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے بے رحم اور ساتھ ہی ساتھ معصوم قلم سے 'صاحب'، 'جناب' اور 'آپ' کا خالق بنا اور سوانحی خاکوں کے ضمن میں نامور اور منفرد مانا گیا۔

'محترم' کی ادبی خوبیوں اور طرزِ نگارش کی بلوغت اور رنگینی طنز و مزاح کے باموقع استعمال اور دوسرے ادبی محاسن کا تنقیدی جائزہ دوسرے اصحاب علم و ادب اور صاحبِ فکر و نظر کے لئے چھوڑ کر میں صرف اس مختصر سے سفرنامے کے اُس حصے کے سلسلے میں بات کروں گا جو کہ سندھ سے، متعلق ہے۔ یہ تذکرہ صفحہ ۲۰ سے صفحہ ۸۸ تک ہے۔ صفحہ ۳۲ پہ طفیل صاحب نے ایک عجیب بات لکھی ہے کہ

"میں نے یہاں سارے ہی پڑھے لکھے سندھیوں میں یہ بات دیکھی کہ اگر آپ بات اردو میں کریں تو وہ آپ کو انگریزی میں جواب دیں گے۔ یہ اگر اُردو سے تعصب کی بات نہیں تو اس سے ملتی جلتی کوئی بات ضرور ہے۔ میں نے حیدرآباد کی دیواروں پہ یہ لکھا بھی دیکھا 'ون یونٹ توڑ دو'۔ 'اردو ہماری زبان نہیں'۔"

اس بات کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق پڑھے لکھے سندھیوں سے ہے اور دوسرے کا تعلق حیدرآباد کی دیواروں سے۔ اب طفیل صاحب سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے لوگوں سے تو شاید باتیں نہیں کیں بلکہ انہیں دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگا اور ان تحریروں کو مسند مان کر اپنی رائے لکھی کہ پڑھے لکھے سندھی اردو میں کی ہوئی بات کا جواب انگریزی میں دیتے ہیں۔ کیا ہم نوشتہ دیوار کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر منظور کر لیں؟ یہ طفیل صاحب کا خام خیالی ہے اور اصل مسئلے سے گریز کی مانند ہے۔

کسی بحث یا دل آزار گفتگو میں الجھنے سے گریز کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ سندھ بھی اردو کا ایک مولد ہے اور یہاں کے لوگوں نے اس زبان

میں بہترین شاہکار تخلیق کئے ہیں اور بہترین اردو شاہکاروں کے سندھی زبان میں منظوم ترجمے کئے ہیں۔ سندھ کا ہر مرد و زن، بچہ اور بوڑھا، دیہاتی اور شہری، پڑھا لکھا اور طالب العلم اردو زبان نہ صرف اپنی ضروریات کے مطابق بولتا ہے بلکہ آزادی سے قبل برسوں سے اس زبان کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ حقائق، اردو اہلِ قلم حضرات کی بے توجہی کی وجہ سے منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں۔ باقی رہا سوال دیواروں پہ تحریروں کا۔ یہ معاملہ بھی صاف ہے۔ یہ نعرے اردو میں لکھے ہوئے تھے جس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھی اردو جانتے ہیں۔ ون یونٹ توڑنے کے نعرے سیاسی اور انتظامی امور سے متعلق ہیں اور یہ میری بات چیت کا موضوع نہیں اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کا اُردو سے بھی کوئی تعلق نہیں البتہ اسے سفرنامہ میں بیان کرتے ہوئے طفیل صاحب نے اپنے دل لگی بات کی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اُردو پاکستان کے کسی بھی حصہ کے لوگوں کی مادری زبان نہیں۔ وہ چند مصلحتوں کی وجہ سے بنائی ہوئی رابطے کی قدیم زبان ہے اور آج اس کی اہمیت اور توقیر سے انکار کرنا جہالت کی انتہا ہے۔ لیکن اس زبان کو مغربی پاکستان میں قدیم اور اصلی زبانوں کے مقابلے میں اعلیٰ اور برتر مقام دلانے کے لئے ضروری ہے کہ تشدد سے کام نہ لیا جائے اور زبانوں کے پنپنے اور وسعت پذیر ہونے کے جو فطری تقاضے ہوتے ہیں انہیں خود بخود عمل پذیر ہونے دیا جائے۔

مغربی پاکستان کی مختلف زبانوں کے الفاظ کو اردو میں عوامی ضروریات

کے مطابق داخل ہونے دیا جائے اور یہاں کے قدیم ادبا اور شعرا کو بھی اپنا لیا جائے۔ بس سندھی زبان بولنے والے، اُردو بولنے والوں سے فقط اس حقیقت پسندانہ رشتے کا تقاضا کرتے ہیں اور یہی چاہتے ہیں جیسا کہ طفیل صاحب نے "محترم" کے صفحہ ۱۰۷ سے ۱۱۰ تک نقوش کے شمارہ ۹۷ کا اداریہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو زبان جسے اپنے گھر سے دھکّے مار کر نکالا گیا ہے اور اس کا مرکز بھی بدل چکا ہے اسے مغربی پاکستان کے گلی کوچوں کی زبان بننا ہوگا اور اس فکری تغیّر کے لئے آج اردو کو اہلِ پنجاب کی اکثریت کے ساتھ ساتھ اہلِ سرحد، اہلِ سندھ اور اہلِ بلوچستان کی اقلیتوں کے مزاج کا بھی ساتھ دینا ہوگا اور ان سارے خطوں کے خمیر سے جو اُردو بنے گی، وہی مستقبل کی اُردو ہوگی۔

سندھ میں اردو دشمنی کے نعرے لگانے والے نام نہاد ادیبوں اور جھنڈا گاڑنے والے مبلغوں کا بھی ہر سطح پر محاسبہ کرنا ضروری ہے اور "محترم" میں اسی طرح کی محتسبانہ باتیں پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب حقیقت کے عیاں ہونے سے باطل کا بُت پاش پاش ہو جائے گا اور مزید غلط فہمیاں پیدا نہیں ہوں گی۔ اس قسم کے ایک استاد کے تذکرہ میں طفیل صاحب نے لکھا ہے کہ

جمیل الزماں نے کہا "آج استاد ہمارے ساتھ نہیں ہے"۔

اس پر ریاض انور نے کہا "وہ تو صبح ہی سے غائب ہیں"

"کیوں؟"

"کل رات جب ہم ہوٹل واپس جا رہے تھے تو استاد نے طفیل سے کہا۔ میری کتاب 'وادیٔ مہران' پڑھ لینا۔ دو چار لفظ سیکھ جاؤ گے"

اس پر طفیل نے جواب دیا تھا "بے شک دو چار لفظ سیکھ جاؤں گا۔ مگر جو چھ سات الفاظ آتے ہیں انہیں گنوا بیٹھوں گا"

جمیل الزماں نے کہا "بات تو زوردار ہوئی مگر وہ ایسے ہیں نہیں کہ اُن پر کسی بات کا اثر ہو۔ وہ تو ہنس ہنس کر سب کچھ پی جاتے ہیں"

ریاض نے کہا "جو کچھ بھی ہو مگر ان کی ساکھ بڑی خراب ہے اس کی وجہ سے پوری ادیب برادری بدنام ہوتی ہے ......"

جمیل الزماں نے اختر انصاری اکبرآبادی کی وکالت کی "مجھے اور کسی بات کا پتہ نہیں۔ ویسے میں استاد کے چاہنے والوں میں ہوں۔ وہ تنہا شخص ہے جس نے سندھ میں اُردو کا جھنڈا گاڑ رکھا ہے"

سندھ میں پیروں، فقیروں، سیّدوں اور عالموں نے بہت سے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں جو سندھ اور سندھیوں کی پسماندگی اور جہالت کی وجہ بنے ہوئے ہیں اور شاید یہی باتیں خیال میں رکھتے ہوئے محسن بھوپالی نے کہا کہ "استاد سے کہیئے کہ اب وہ اپنا جھنڈا سندھ سے اُکھاڑ لیں اور اسے لے جا کر پنجاب میں گاڑ دیں"

اس بات پر طفیل صاحب، معلوم ہوتا ہے گھبرا گئے، کیونکہ اس استاد کے پنجاب چلے آنے سے بہت سے استادوں کی استادی کو خطرہ لاحق ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس لئے طفیل صاحب نے لکھا ہے کہ "میں نے سوچ

اگر یہ بھنک استاد کے کان میں پڑ گئی تو کہیں وہ اپنا جھنڈا لے کر پنجاب کا رُخ نہ کرلیں"۔ چنانچہ گھبرا کر کہا "ابھی استاد کا کام ادھورا ہے۔ لہٰذا ان کا یہاں (سندھ) سے ہٹنا نقصان دہ ہوگا"۔ (صفحہ ۵۳۔۵۴)

'محرم' کے صفحہ ۴۹ پر ایک اور عجیب بات نظر آتی ہے جو حقائق سے بعید ہونے کے باوجود مزیدار بھی ہے۔ یہ بات غلام محمد (کوٹری) بیراج سے متعلق ہے۔

"محسن بھوپالی اسسٹنٹ انجینئر ہیں۔ انہوں نے اس بیراج پر، جب یہ زیر تعمیر تھا کام کی بھی نگرانی کی تھی، اس لئے بتا رہے تھے کہ یہ سڑک جس پر ہم چل رہے ہیں (دریا کے اوپر والی سڑک) اپنے موجودہ جگہ سے پوری کی پوری اور اوپر اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ رعایت اس لئے رکھی گئی ہے کہ اگر دریا کا پانی زیادہ اونچا ہوجائے تو پُل کو بچایا جاسکے۔ وہاں سے دریا کا پانی تین اطراف کو بڑی خوبصورتی سے موڑا گیا تھا۔ جدھر پانی کی ضرورت ہوتی ہے اُدھر پانی کا رُخ موڑ دیا جاتا ہے۔ جدھر پانی کی ضرورت نہ ہو ادھر پانی جا ہی نہیں سکتا۔ انجینئروں کی یہ حیرت انگیز سوجھ بوجھ تھی جس سے پانی روکا اور چھوڑا جاتا ہے"۔

یوں تو ادیبوں اور شاعروں کے لئے انجینئر ہونا کوئی بڑی بات نہیں میرزا رُسوا بھی انجینئر تھے لیکن انہوں نے کسی ریلوے لائن کے نقشے بناتے وقت ایسا انتظام نہیں کیا جو پوری کی پوری سڑک اُوپر آجائے۔ بیراج کی تعمیر یوں ہوتی ہے کہ یہ دریا پر ایک قسم کا بند ہوتا ہے جس میں دروازے ہوتے ہیں اور دریا کے دونوں جانب نہریں ہوتی ہیں ان میں بھی دروازے

ہوتے ہیں تاکہ ضرورت کے مطابق پانی کی تقسیم کی جاسکے۔ غلام محمد بیراج بھی دوسرے بیراجوں کی طرح ایک معمولی سا بند ہے۔ پُل کے درمیان میں حیدر آباد کی سمت کوئی بیس فٹ چوڑا ایک ٹکڑا اس طرح سے باقی پُل سے منسلک کیا گیا ہے کہ اگر سکھر کی طرف سے کوئی کشتی آجائے تو اس ٹکڑے کو جو کہ دو SPILL WAYS پر مشتمل ہے اُوپر اٹھایا جائے اور کشتی کو پُل سے پار کیا جاسکے۔ پُل کے ساتھ ایک تالاب سا بھی بنایا گیا ہے تاکہ اگر پانی کی سطح کم ہو تو اس تالاب کو پانی کی مطلوبہ سطح مہیا کی جائے۔

بس اس ٹیکنیکل بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُسے انجینئروں کی حیرت انگیز سوجھ بوجھ بتایا گیا۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا عجوبہ بھی نہیں جیسا کہ میرزا رسوا نے کوئٹہ میں ملازمت کے دوران بلوچی شاعروں سے مل کر شعر سنجی اور سخن فہمی کو جلادی تھی۔

'محرم' کے صفحہ ۶۵ سے لے کر صفحہ ۷۱ تک سندھ کی تاریخ کا ذکر آتا ہے اور صفحہ ۸۲ تک شاہ لطیف کے زمانے اور ان کے خاندانی حالات کی تفصیل ہے۔ صفحہ ۸۳ سے صفحہ ۸۸ تک، شاہ صاحب کے کلام کا تجزیہ اور ان کے چند ابیات کا منظوم ترجمہ ہے۔

ان باتوں کے سلسلے میں طفیل صاحب نے صفحہ ۶۴ پر صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ ٹھیک ہے کہ میرا موضوع یہ نہیں کہ میں سندھ کی تاریخ لکھنے بیٹھ جاؤں یا میں اس وقت کی سماجی حیثیت پر گفتگو کروں یا شاہ صاحب ہی کے بارے میں لمبی چوڑی باتیں چھیڑ دوں، جہاں یہ سب کچھ مناسب نہیں وہاں مناسب یہ بھی نہیں کہ گپ شپ کرکے گھر لوٹ جاؤں۔ لہٰذا وہ

یادداشتیں، وہ واقعات جنہیں دوستوں کی گفتگو سے چُرایا یا جنہیں تقریروں اور تحریروں سے اُڑایا انہیں جُوں کا تُوں لکھے دیتا ہوں۔ صرف سرسری سے جائزے کی خاطر، صرف سرسری سے پس منظر کے طور پر۔"

طفیل صاحب کی طرف سے اس وضاحت کے بعد میں ان غلطیوں اور خامیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو کتاب میں صفحہ ۶۵ سے لے کر صفحہ ۷ تک مجھے نظر آئیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ طفیل صاحب کے اس نیم تاریخی تذکرہ کو، کوئی مبتدی مستند سمجھ کر دوبارہ استعمال نہ کرے جیسے صوبائی موضوعات کے بارے میں اردو ادیب اب تک کرتے رہے ہیں۔ اس لئے چند وضاحتیں ضروری ہیں۔

صفحہ ۶۵ پر کوٹ ڈیجی اور موہن جو دڑو کے لوگوں کی آپس میں جنگ کا ذکر ہے۔ تاریخ کی کسی بھی کتاب اور ماخذ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ دراصل ایک ہی تہذیب کا گہوارہ تھے اور کوٹ ڈیجی تمدن کو تقدم حاصل ہے۔

صفحہ ۶۷ پر عربوں کے سندھ پر حملے کے سلسلے میں سراندیپ (سری لنکا) کے راجا، سندھ کے برہمن حاکم ڈاہر اور عراق کے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کا ذکر آتا ہے۔ طفیل صاحب نے لکھا ہے کہ برہمنی عہد میں سندھ کے عوام کو جن کی اکثریت بودھ دھرم کو مانتی تھی طرح طرح کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ حکومتِ وقت کے مخالف ہو گئے اور خفیہ طور پر حجاج کی مدد حاصل کرنے کے لئے قاصد روانہ کئے۔

محمد بن قاسم نے جو سندھ پر حملہ کیا تھا وہ ہماری تاریخ میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس عظیم الشان تاریخی واقعہ سے متعلق پاکستان میں کوئی تحقیقی کام نہیں ہو رہا ہے۔ "عرب و ہند کے تعلقات" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کو اپنے قلمرو میں شامل کرنے کے سلسلے میں عربوں کا یہ پہلا حملہ نہیں تھا۔ یہ کوششیں خلافتِ راشدہ کے ایام سے ہوتی آرہی تھیں اور یہ تاریخی اور تمدنی تقاضوں کے عین مطابق تھیں۔ اس معرکہ کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں البتہ یہ حقیقت ہے کہ بحیرہ سندھ میں جن جہازوں کو سمندری قزاقوں نے لُوٹا تھا ان میں بغداد کے خلیفہ کے لئے بھیجے گئے قیمتی تحائف کے علاوہ سراندیپ سے خریدی ہوئی غلام دوشیزائیں اور سندھ سے خریدے گئے ہوئے غلام مرد اور عورتیں بھی تھیں جن میں کچھ قزاقوں کی رشتہ دار بھی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ تصادم ہوا اور جہازوں کو لُوٹا گیا۔ عربوں کی عسکری برتری اور جذبۂ ایمانی کی ناقابلِ تسخیر قوت کے علاوہ سندھی عوام کی بھرپور تائید نے عربوں کی فتح کو نسبتاً آسان بنا دیا۔ اس تائید کے پس منظر میں سندھ کے بودھ عوام اور عرب حکمرانوں کے درمیان کوئی سیاسی، فوجی یا کسی اور قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے کردار کی داستانوں سے انہیں یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت میں عزتِ نفس، عظمتِ آدم، حقوقِ انسانی کی حفاظت ہوگی اور مساوات، اخوت اور محبت کے فروغ سے فلاحی معاشرے کی تشکیل ہو سکے گی جہاں عوام آزادی، استحصال اور استیصال کی حرکتوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ چنانچہ

فتح سندھ کے بعد محمد بن قاسم نے ایسا ہی نظام رائج کیا اور سندھ کو "باب الاسلام" کہا جانے لگا۔

عربوں کے بعد، سندھ میں کبھی غیروں کی حکومت نہیں رہی۔ سندھ پر نہ تو غزنوی حکومت قائم ہوئی اور نہ ہی سندھ ایرانی حکومت کے تابع رہا جیسے صفحہ ۶۸ اور ۷۰ پر لکھا گیا ہے۔ بس باہر سے حملہ آور آتے تھے، لوٹ مار کر کے واپس ہوتے تھے، حکمراں مقامی لوگ رہتے تھے۔ البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ ان مقامی لوگوں نے یہاں کے عوام کی بھلائی اور بہبود کے لئے کوئی جتن نہیں کئے۔

باہر سے جو عالم اور فاضل یا رُوسا آئے تو انہوں نے بھی کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا کہ لوگوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے ان کی سیاہ بختی میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور انہیں زمانے کی روش سمجھنے اور اپنی تقدیر بدلنے کا فن آج تک نہیں آیا۔

سمرسیٹ مہام نے اپنی شاہکار تصنیف "آف ہیومن بانڈیج" میں لکھا ہے کہ لوگ آپ سے تنقید کا تقاضا کرتے ہیں لیکن دراصل وہ ستائش کے طلبگار ہوتے ہیں۔ میں اس انسانی کمزوری سے آگاہ ہوں۔ اس لئے میں نے اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل چار نکات کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے۔

۱۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، کیا یہ سچ ہے؟

۲۔ کیا یہ سب متعلقین کے لئے مناسب ہے؟

۳۔ کیا اس سے خوشگوار ماحول اور بہتر دوستانہ تعلقات پیدا ہوں گے؟

۴۔ اور کیا یہ سب متعلقین کے لئے فائدے مند ہوگا؟

مجھے یقین ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھیں گے اور دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے تب ہی قومی یکجہتی، قومی کلچر، قومی زبان اور پاکستانی قومیت کی تشکیل و تعمیر ہو سکے گی۔ اگر میری ان حقیقت پسندانہ معروضات سے کوئی صاحبِ فکر ناراض ہوتا ہے تو میں صاحبِ محترم کے الفاظ میں یہی عرض کروں گا کہ "بادشاہو! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں"۔

(لاہور، ۱۹۶۸ء)

—ooo—

مُفکّرِ مہران

محکمہ اطلاعات جنوبی علاقہ مغربی پاکستان حیدرآباد کی طرف سے حسبِ دستور امسال بھی وادیٔ مہران کے عظیم مفکر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کی ذاتِ بابرکات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کی ۲۱۱ ویں برسی کے موقع پر 'مفکرِ مہران' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ صفحہ اول نے 'بسم اللہ بر غلط' کے مصداق مفکرِ مہران کی سرخی حرف 'ف' کی تشدید کے ساتھ مفکرِ مہران لکھ کر قارئین کے ذہن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ اس کتاب میں صحت لفظی سے بالکل بے احتیاطی برتی گئی ہے۔

'پیش لفظ' میں مرحوم مولوی عبدالحق صاحب کے بیان کئے ہوئے اس دعویٰ سے ہم ہرگز متفق نہیں کہ اس سے قبل محکمہ اطلاعات کی شائع کردہ کتاب 'نغماتِ لطیف' صرف اختر انصاری اکبرآبادی نے مرتب کی تھی اور اس پر ان کی بدولت ملک کے گوشے گوشے سے تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ کتاب 'نغماتِ لطیف' درحقیقت تین سندھی اہلِ قلم میر شفیع احمد علوی، کریم بخش خالد اور شیخ عبدالحلیم جوش کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھا اور اختر انصاری نے صرف برائے نام حصہ لے کر اپنے نام کا سستا لیبل لگانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور کچھ پیسے وصول کئے تھے۔

'مفکرِ مہران' کے پیش لفظ میں بیان کی ہوئی اس رائے پر ہمیں بےحد تعجب ہوتا ہے کہ "ہم نے (ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات نے) اس علاقے کے مشہور ادیب و شاعر جناب اختر

انصاری اکبرآبادی صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ہمیں شاہ صاحب پر ایک مستقل کتاب لکھ کر دیں۔"

بعض اوقات نام کی مناسبت کی وجہ سے بھی بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے چونکہ اختر انصاری اکبرآبادی کا نام اردو کے مشہور ادیب جناب اختر انصاری دہلوی کے نام سے بالکل ملتا جلتا ہے اس لئے بعض ادبی حلقوں میں بڑی غلط فہمی کی بنا پر اسے اردو ادب کا ایک عظیم مفکر، ادیب اور شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ ورنہ اختر انصاری اکبرآبادی کا اردو ادب میں جو مقام ہے وہ اس شعر سے بالکل واضح ہے جو اردو دان طبقہ میں بچہ بچہ کی زبان پر جاری و ساری ہے ؎

کچھ بھید نہیں کھلتا، کیا چیز ہے نیاری
اختر ہے کہ انصاری، اکبر ہے کہ آبادی۔

اس کے علاوہ کتاب 'مفکرِ مہران' کسی نے بھی مرتب کی ہو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں لیکن یہ دعویٰ حقیقت سے بالکل بعید ہے کہ یہ کتاب شاہ پر ایک مستقل کتاب ہے۔ کیونکہ اس محکمہ کی طرف سے اس سے قبل اردو زبان میں 'نذرِ لطیف'، 'تحفۂ لطیف' اور 'گلستانِ لطیف' کے نام سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، 'مفکرِ مہران' میں ان کی نقل اور چربہ کے علاوہ کسی قسم کا قابل قدر اضافہ نظر نہیں آتا۔ صرف ان ہی مضامین کے مختلف حصوں کو دوبارہ قلم بند کیا گیا ہے مثلاً شاہ کا دور، شاہ کے کلام میں پھولوں اور پھلوں کا تذکرہ، اور دیگر متعدد مضامین اور نظمیں معمولی ترتیب اور تبدیلی عنوان کے ساتھ دوبارہ نقل کی گئی ہیں اور کتاب کا کوئی بھی عنوان اپنے موضوع پر دلالت نہیں کرتا۔ تمام باتیں بالکل بے تکی، زبان روزمرہ اور محاورات کی اغلاط سے بھری ہوئی ہیں۔

ہم ان کے ہر ایک عنوان پر اجمالی بحث کرتے ہیں۔

کتاب کا پہلا عنوان 'سندھی زبان ایک منظر میں' ایک طفلانہ تحریر ہے اور اس میں کسی قسم کی تاریخی اور تحقیقی چیز نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ "انگریزوں کے اقتدار کے زمانہ میں ہندوؤں کے عروج اور اثر کے باعث کچھ ہندی الفاظ بھی قائم کر لئے گئے" بالکل لغو اور حقائق کے خلاف ہے۔ سندھی زبان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ عربوں کی آمد سے بھی پہلے موجود تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں تو عربی سندھی رسم الخط رائج ہوا اور سندھی زبان عربی اور فارسی کی آمیزش سے جدید اردو زبان کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ہندوؤں کا اقتدار صرف سیاسی اور تجارتی تھا اور سندھی زبان پر ہندی اور سنسکرت کے ثقیل اور غیر مروج الفاظ استعمال کرنے کے حربہ میں وہ قیام پاکستان تک بھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

'سندھی شاعری کا مختصر جائزہ اور شاہ صاحب' کے عنوان کے تحت فقط چند سطریں لکھی گئی ہیں اور سندھی زبان کی تدریجی ترقی پر کوئی بحث نہیں کی گئی البتہ صرف چند قدیم شعرا کے نام گنوانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

'شاہ کے مختصر حالاتِ زندگی' کے عنوان میں معمولی املا کی بھی غلطیاں موجود ہیں۔ مثلاً قلیچ بیگ کو قلیج بیگ اور سلسلۂ نسب کو سلسلہ نصب لکھا گیا ہے۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی اس عنوان کی اکثر باتیں غلط اور طفلانہ انداز میں لکھی گئی ہیں: مثلاً شاہ کے زمانے میں مغل اقتدار رخصت ہو رہا تھا اور حکومت مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر کلہوڑا خاندان کے قبضہ میں آ رہی تھی۔ درحقیقت سندھ کا کلہوڑا خاندان، خاندانِ مغلیہ کا باجگزار تھا۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد ایران کا باجگزار رہا۔ اور بعد میں

احمد شاہ ابدالی کے عہدِ سلطنت سے لے کر آخر دم تک کابل کا باجگزار رہا۔ اسی طرح یہ بالکل غلط ہے کہ حکومت مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر کلہوڑا خاندان کے ہاتھ میں آئی۔

اختر اکبر آبادی کا یہ کہنا بھی حقیقت پر مبنی نہیں کہ شاہ کی سوانح میں صرف مرزا قلیچ بیگ کا تذکرہ کچھ مستند معلوم ہوتا ہے اور دوسرے سب تذکرے غلط ہیں۔ حالانکہ مرزا قلیچ بیگ نے خود فارسی تذکروں سے استفادہ کیا ہے جن میں سے میر عبدالحسین خان سانگی کی تصنیف 'لطائف لطیفی' قابلِ ذکر ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی سراسر غلط ہے کہ شاہ نے اپنی شاعری میں عربی اور فارسی کے زوال پذیر اثر کو کبھی قبول نہیں کیا کیونکہ شاہ کا دور فارسی زبان کے خاص عروج کا دور تھا۔ فارسی دفتری زبان تھی۔ سندھ کے مشہور عالم، ادیب اور شاعر جناب مولانا حکیم فتح محمد سیوہانی مرحوم نے اپنی کتاب 'آفتاب ادب' میں شاہ، سچل، ساقی اور دوسرے بزرگوں کے کلام میں عربی فارسی الفاظ کا انبار' کے عنوان سے حضرت شاہ صاحب کے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کی ایک فہرست پیش کرتے ہوئے اس بات کا مکمل ثبوت پیش کیا ہے کہ شاہ صاحب نے عربی اور فارسی الفاظ، قرآن و حدیث کے اقتباسات اور دیگر اسلامی اصطلاحات سے سندھی زبان کو مالا مال کر دیا ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اختر اکبر آبادی عربی و فارسی الفاظ سے اسقدر خائف کیوں ہیں جبکہ صفحہ ۲۷ پر خود ہی لکھا ہے کہ "شاہ صاحب کے دور میں عربی کے بعد فارسی کا غلبہ تھا"۔ شاہ صاحب کا فارسی کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس کے علاوہ خود جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ موجودہ عربی و فارسی آمیز اردو میں اور امیر خسرو والی دکنی یا نظیر اکبر آبادی جیسی ہندی آمیز اردو استعمال نہیں کی۔ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں

کی وحدت عربی و فارسی الفاظ کی مشترکہ آمیزش کے بغیر ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ پھر ان مروج الفاظ کی مخالفت آخر چہ معنی دارد؟

بعد میں لکھتے ہیں کہ شاہ کے بزرگ امیر تیمور کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ اس اعتبار سے آپ کا تعلق اور رشتہ متعلوی سیدوں سے بہت قریبی ہے۔ متعلوی سادات کون تھے اور ان کا رشتہ اور تعلق شاہ صاحب کے خاندان سے کیسے استوار ہوا؟ اس کے متعلق انہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس طرح کا استدلال ایک عجیب مضحکہ خیز اور طفلانہ بات معلوم ہوتی ہے۔

'شاہ جو رسالو' کی تفصیل میں لکھا ہے کہ شاہ جو رسالو ایک طور پر شاہ کا مجموعہ کلام ہے جسے دیوان تو کیا کلیات کہا جا سکتا ہے۔

پہلے زبان پر غور فرمایئے، کیا کسی اہلِ زبان کا اندازِ بیان یہ ہو سکتا ہے کہ "شاہ جو رسالو ایک طور پر شاہ کا مجموعہ کلام ہے" تو پھر دوسرے طور پر کیا ہے؟ جسے دیوان تو کیا کلیات کہا جا سکتا ہے۔ عام محاورہ تو یہ ہے کہ دیوان تو کیا کلیات بھی نہیں کہا جا سکتا اگر کہا جا سکتا ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ جسے دیوان نہیں کلیات کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت شاہ کا مجموعہ کلام نہ تو دیوان ہے نہ کلیات کیونکہ دیوان اور کلیات اُس مجموعہ کلام کے نام کے لئے مخصوص ہے جو عربی اور فارسی بحروں میں کہا گیا ہو۔ ابجد کے حساب سے ردیف وار مرتب کیا ہوا ہو۔ اور کلیات سب ہی اصنافِ سخن پر مشتمل کلام کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاہ صاحب کے ابیات عربی اور فارسی بحروں کے بجائے خالص ہندی چھند ودیا اور خالص سندھی موسیقی کی مترنم بحروں میں کہے گئے ہیں لہٰذا اس کا نام 'رسالہ' ہی موزوں ہے اور

اسے دیوان یا کلیات ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

زبان کی غلطی کی چند مثالیں اور ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں "کہ ۱۹۰۰ء میں نئی ترتیب کے ساتھ تیسرا اس لئے شائع کیا گیا ہے کہ پرانے نسخے قدیم رسم الخط میں تھے"۔ تیسرا کیا شائع کیا گیا ہے؟

یا یہ عبارت کہ "شاہ جو رسالو کی اشاعت سے قبل ہی رسالہ کی شہرت عام ہو چکی تھی اور متعدد قلمی نسخے کر لئے گئے تھے۔ کیا "شاہ جو رسالو کی اشاعت سے قبل کسی دوسرے رسالے کی شہرت عام ہو چکی تھی؟ اور متعدد قلمی نسخے کر لئے گئے تھے" یہ کہاں کی اردو ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

اختر اکبرآبادی نہ صرف زبان سے ناواقف ہیں بلکہ عام معلومات سے بھی بالکل بے بہرہ۔ ان کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۶۱ء میں شاہ صاحب کی ۲۰۹ ویں برسی پر جناب علامہ آئی آئی قاضی کا مرتب کردہ شاہ کا 'رسالہ' پیش کیا گیا تھا لیکن اختر اکبرآبادی ۱۹۶۳ء میں دو سال کے بعد بھی یہ لکھتے ہیں کہ معلوم ہوا ہے کہ علامہ آئی آئی قاضی 'شاہ جو رسالو' کو جدید ترین طریق پر مرتب کر رہے ہیں۔

'شاہ جو رسالو کا اندازِ تصنیف' کے عنوان میں لکھا ہے کہ 'شاہ جو رسالو' کا انداز منفرد ہے اور تیور نرالے۔ 'شاہ جو رسالو' کے تیور آج تک کسی نے نہیں دیکھے تھے۔ ماشاءاللہ اختر اکبرآبادی نے جو تیور دکھائے ہیں اُن کا جواب نہیں۔

بعد میں لکھا ہے کہ 'شاہ جو رسالو' کے چند معروف ابواب کو سُر کلیان، سُر یمن کلیان، سُر سوہنی، سُر سسئی، سُر سورٹھ، سُر کھمبات، سُر مومل رانو، سُر سامونڈی، سُر سری راگ اور سُر کاموڈ کا نام دیا گیا ہے۔ کیا 'شاہ جو رسالو' کے دوسرے تمام سُر غیر معروف ہیں اور

ان کو کوئی بھی نام نہیں دیا گیا ہے ؟

مزید یہ بھی لکھا ہے کہ "بات ادھوری رہ جاتی ہے، اگر ایک حقیقت کی وضاحت نہ کر دی جائے، کچھ سُر ایسے بھی ہیں جنہیں سروں کا نام تو دے دیا گیا ہے مگر وہ اپنی ذات سے کوئی راگ نہیں بلکہ صرف نام ہے۔"

اختر اکبر آبادی نے جو ادھوری اور بے تکی بات کہی ہے وہ ہر حالت میں ادھوری اور بے تکی ہی ہے۔ کیونکہ شاہ نے جو بھی سُر ایجاد کئے ہیں وہ سب خالص سندھی راگ ہیں اور صرف نام نہیں۔ اختر صاحب تو فرماتے ہیں کہ یہی صورت سُر سسئی آبری کی ہے۔ یہ کوہیاری میں گایا جاتا ہے یہی صورت سر حسینی کی بھی ہے۔

حالانکہ سُر سسئی اور سُر حسینی کو وہی موسیقار دوسرے سروں میں گاتے ہیں جن کو ان سروں کے اصلی راگ سے کوئی واقفیت نہیں۔ یہ سر حضرت شاہ صاحب کی درگاہ پر اب بھی اپنی اصلی صورت میں گائے جاتے ہیں جس کے متعلق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ اور پاک و ہند کے مشہور موسیقار ماسٹر چندر نے تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں ہمیں بیحد افسوس ہے کہ اختر صاحب کو اگر ان باتوں سے متعلق کوئی معلومات نہ تھیں تو اس سے ہر طرح گریز کرتے تو اچھا تھا۔

اختر نے اس کتاب میں نہ صرف نثری مضامین میں املا روزمرہ اور محاورات کی غلطیاں کی ہیں بلکہ شعرائے کرام کے منظوم اُردو تراجم کی بھی اچھی خاصی مٹی پلید کر کے انہیں موزوں سے غیر موزوں بنا دیا ہے مثلاً "روحِ لطیف" میں رشید لاشاری کا یہ شعر کہ ست

والی و رزاق، احد رب الرحیم
اس کو سچا جان کر حمد حکیم

لیکن اختر صاحب نے اس شعر کو یوں نقل کیا ہے۔

والی و رزاق اور رب الرحیم
اسس کو سچا جان کر حمد حکیم

ذرا مصرع اول کی تقطیع پر بھی غور فرمائیے۔ قارئین تو یہی کہیں گے کہ رشید لاشاری موزوں شاعری سے بالکل ناواقف ہیں۔ درحقیقت اکبر آبادی میں کسی شعر کو اصلیت اور موزونیت کے ساتھ نقل کرنے کی بھی صلاحیت نہیں۔

شاہ کے کلام اور سندھی ادب و تاریخ سے نابلد ہونے کی ایک مثال یہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ "شاہ نے وائی کو کافی کا روپ بھی دیا ہے" "شاہ کی کافیاں" کا ایک مستقل عنوان بھی قائم کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ نے نہ تو کافیاں کہیں ہیں اور نہ ان کے مجموعہ کلام "شاہ جو رسالو" میں کوئی کافی موجود ہے۔ اکبر آبادی نے جناب حفیظ ہوشیارپوری کا جو منظوم اردو ترجمہ شاہ کی کافی کے عنوان سے پیش کیا ہے وہ درحقیقت کافی نہیں بلکہ شاہ کی وائی کا منظوم اردو ترجمہ ہے اور عام طور پر شاہ کی جو کافیاں گائی جاتی ہیں وہ سب شاہ کے معتقدین کی ایجاد کردہ ہیں اور ان میں شاہ کا نام استعمال کیا گیا ہے۔

"شاہ کا ایک تجربہ" کا عنوان شاہ صاحب کے مشہور و معروف ناقدین اور شارحین پر ایک ذاتی حملہ ہے یعنی اختر صاحب کا الزام ہے کہ "شاہ کے بعض ناقدین نے ایک ستم یہ کیا ہے کہ شاہ کے کمالات شعری کا جائزہ لینے کی بجائے موازنہ شروع کر دیا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب نے لطیفی ادب کا قطعی مطالعہ نہیں کیا،

ورنہ ایسی بے تکی بات ہرگز نہ کہتے۔ سندھ کے وہ بزرگ نقاد اور شارح جنہوں نے شاہ کے کلام پر شرحیں لکھی ہیں ان میں سے تو کسی نے بھی شاہ کا موازنہ کسی دوسرے شاعر کے ساتھ نہیں کیا باقی متعدد مضمون نگاروں نے اس موضوع پر ضرور طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اختر صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اردو ادب میں جب موازنۂ انیس و دبیر، موازنۂ غالب و ذوق، موازنۂ انشا و مصحفی وغیرہ کا بیش بہا تنقیدی سرمایہ موجود ہے تو پھر سندھی ادب میں شاہ کا دوسرے ہمعصر یا ہم مشرب شاعر کے ساتھ موازنہ کرنا کون سا گناہ ہے؟ کیا موازنہ ادبی افادیت کا ایک پہلو نہیں۔

اسی طرح اختر صاحب نے ایک عظیم غلطی یہ کی ہے کہ لکھا ہے کہ وائی شاہ کی اپنی ایجاد ہے۔ حالانکہ پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے سندھی محققین کی تحقیق کے مطابق وائی شاہ سے کافی عرصہ پہلے سندھی ادب میں موجود تھی اور سندھ کے مشہور تاریخی شہر ہالا شریف کے بزرگوں کی قدیم وائیاں اس امر پر پوری دلالت کرتی ہیں۔

اختر اکبر آبادی نے شاہ کی داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جس غلط بیانی سے کام لیا ہے وہ سندھی ادب کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ وہ شخص جس کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ماروی کے گاؤں کا نام مالیر تھا یا ملیر۔ وہ اپنی تحقیق کے مطابق یہ لکھتا ہے کہ "عمر سومرو مایوس ہو جاتا ہے اور آخر کار یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اگر مارو قبیلے کے لوگ ایک سال کے اندر اس کو یہاں سے رہا کرا کے لے جاتے ہیں تو یہ لڑکی ان کی ہے ورنہ اس کو مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔"

نہ جانے اکبر آبادی نے ماروی کے قصے میں اس نئی تحقیق کا اضافہ کہاں

سے کیا ہے۔ یہ واقعہ سندھ کی کسی بھی روایت سے وابستہ نہیں۔ آگرہ اور بریلی کی روایت ہو تو اور بات ہے۔

"عبادت اور فلسفہ و حکمت" کے عنوان میں صفحہ ۵۵ پر شاہ صاحب کا مندرجہ ذیل سندھی بیت پیش کیا ہے ؎

مون کھے موں پرین، بدھی وِدھو تار میں
ڈانھا ائیں چون متاں پاڑر پائیں

لیکن اس بیت کا ترجمہ نہیں دیا اور اس کے برعکس بیت کے نیچے یہ لکھا ہے کہ "جس کا ترجمہ اس مشہور فارسی شعر سے ملتا جلتا ہے" ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اختر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شاہ صاحب کا مذکورہ بیت اس فارسی شعر کا ترجمہ ہرگز نہیں اور اگر اسے ترجمہ فرض کر بھی لیا جائے تو پھر بھی شاہ کا تخیل اس سے کہیں ہزار بار بلند ہی نظر آتا ہے اور فن شاعری میں اگر کوئی شعر دوسرے یکساں تخیل والے شعر سے اندازِ بیان میں بڑھ جائے تو اسے سرقہ ظاہری یا غیر ظاہری میں ہرگز شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اختر صاحب شاید یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ شاہ صاحب کے اس بیت کا تخیل فارسی کے مذکورہ شعر کا سرقہ ہے تو پہلے انہیں شاہ صاحب کے اس بیت کا ترجمہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"مجھے میرے محبوب نے باندھ کر پاتال میں پھینک دیا ہے اور خود کنارے پر چلا کر یہ کہہ رہا ہے کہ خبردار دامن مت بھگونا"

شاہ صاحب نے 'باندھ کر پاتال میں پھینکنے' کا جو تصور پیش کیا ہے اس پر ایسے ہزاروں فارسی اشعار قربان کئے جا سکتے ہیں۔

اگر اختر صاحب کو ادبی سرقہ اور توارد کے سلسلہ میں کوئی مزید معلومات کی ضرورت ہو تو وہ اردو کے مایہ ناز محقق اور نقاد ڈاکٹر عندلیب شادانی کی مالیہ تصنیف 'تحقیق کی روشنی میں' مطالعہ کریں۔ یوں بھی علم کسی کی میراث نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اگر دوسروں کی محنت اور مشقت سے اختر صاحب کو کوئی فائدہ پہنچ سکے تو کیا مضائقہ ہے۔

اختر صاحب نے اس کتاب میں متعدد مقامات پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ شاہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اسلامی تصوف کے معارف کو عوامی تمثیلی انداز میں پیش کر کے انسانی زندگی کے مختلف مدارج اور سالکین کی جملہ اقسام سے آگاہ کیا۔ لیکن اس دعویٰ کے باوجود شاہ کا نظریہ اور ان کی زبان شعر کا عنوان قائم کر کے یہ کوشش کی ہے کہ شاہ صاحب صوفی نہیں بلکہ ترقی پسند تھے۔ مثلاً لکھا ہے کہ "جن شعرا نے اپنے دل کی پاکیزگی، سچائی اور انسان دوستی اور دردمندی کو اپنے افکار کی سرخی بنایا ہے وہ سب سے بڑے ترقی پسند تھے"۔ تعجب ہے کہ اسلامی تصوف کا ایک علمبردار عوامی شاعر تو بن سکتا ہے لیکن انہے موجودہ دور کا ترقی پسند شاعر ثابت کرنا آخر کہاں کا انصاف ہے؟ شاید اختر صاحب کی ترقی پسندی سے مراد کہیں کمیونزم تو نہیں! انہوں نے آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ "شاہ کے کلام میں بغاوت کہیں نہیں، البتہ معاشرے کی زبوں حالی سے بیزاری کا اظہار ضرور ہے"۔

بہرحال اکبرآبادی کی یہ متضاد اور بے ربط باتیں ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہیں نہ جانے وہ شاہ کے متعلق کیا کہنا چاہتے ہیں اور ان کے کہنے کا مقصد کیا ہے۔

اسی طرح آگے چل کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاہ صاحب کے زمانے میں وحدۃ الوجود کا نظریہ بالکل فرسودہ ہو چکا تھا اور شاہ کی اختراع پسند طبیعت نے اسے قبول نہیں کیا۔

لغو گوئی اور طفلانہ باتوں کی بھی حد ہوتی ہے لیکن یہ اکبرآبادی صاحب تو حد کی لکیر سے بالکل باہر نکل چکے ہیں۔ ایک طرف تو یہ لکھتے ہیں "شاہ کی زندگی کا بیشتر حصہ صوفیاً اور اولیاء کرام (صوفیائے اور اولیائے کرام) کی صحبت میں گزرا۔ وہ خود صوفی منش انسان تھے۔ مذہب اور عقیدہ کا ان پر گہرا اثر تھا" اور دوسری طرف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "شاہ کی اختراع پسند طبیعت نے وحدۃ الوجود کے فلسفہ کو قبول نہیں کیا"۔ آخر یہ کس دانشمندی کی بات ہے؟ شاہ صاحب تو اپنے کلام کی روشنی میں اول سے آخر تک فلسفہ وحدت الوجود کے حامی نظر آتے ہیں۔ مثلاً سر کلیان کے ایک بیت میں فرمایا ہے۔

ایک قصر در لکھ، کوڑیں کنس گڑکھیوں
جیڈانہہ کریاں پرکھ، تیڈانہہ صاحب سامہوں

رشید لاشاری نے 'روح لطیف' میں اس بیت کا منظوم اردو ترجمہ یوں کیا ہے۔

لاکھ دروازوں کا قصر پر سماں
اور ہر جانب کروڑوں کھڑکیاں
جس طرف بھی دیکھتا ہوں سر بسر
اس طرف آتا ہے وہ مالک نظر

کیا یہ وحدت الوجود کا فلسفہ نہیں تو اور کیا ہے؟ افسوس ہزار بار افسوس، اختر اکبرآبادی کی تحقیق و تنقید کا یہ عالم ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ "ہم پر یہ الزام نہ آ جائے کہ ہمارا سوچنے کا انداز ذاتی ہے اور ہم جس انداز میں شاہ کے افکار پر

تبصرہ کر رہے ہیں وہ ہمارا اپنا نقطۂ نگاہ ہے دوسروں کا نہیں"۔

گر ہمیں مکتب است و ایں ملّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اگر محکمہ اطلاعات کی طرف سے شاہ کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہو کے لئے اختر انصاری اکبر آبادی جیسے شخص کا انتخاب ہوتا رہا تو سندھی اور اردو دونوں زبانوں کا خدا حافظ۔

اختر اکبر آبادی نے اس کتاب میں جہاں دوسری لغویات اور بے تکی باتوں سے کام لیا ہے وہاں یہ ایک بات بھی ان کی دروغ گوئی اور لغویات میں قابلِ قدر اضافہ ہے کہ مجھے مرحوم آغا تاج محمد نے شاہ کے متعلق ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کی جو عبارت بیان کی گئی ہے وہ مرحوم آغا تاج محمد کے اس مشہور مقالے سے ماخوذ ہے جو انہوں نے غالباً ۱۹۵۱ء میں آج سے بارہ سال پیشتر بھٹ شاہ پر اس زمانے میں پڑھا تھا جب اختر اکبر آبادی کا حیدر آباد میں وجود ہی نہ تھا۔ پھر اس کے پاس آغا تاج محمد مرحوم کا وہ خط کہاں سے آیا۔ یہ مقالہ حیدر آباد کے اردو روزنامہ 'پاسبان' کے لطیف نمبر میں بعد میں شائع ہوا تھا۔

قصہ مختصر کتاب 'مفکر مہران' کے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ کتاب نہ صرف اغلاط اور لغویات کا مجموعہ ہے بلکہ شاہ لطیف کی توہین کے ساتھ سندھی اور اردو دونوں زبانوں کے مشترکہ مزاج اور صحت مندی پر بھی ایک ضرب کاری ہے اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔

(ہفت روزہ 'جھنکار' کراچی، ۸ جنوری ۱۹۶۴ء)

شاہ لطیف بھٹائی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ

پاکستان کے عظیم المرتبت صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پیامِ وحدت کو دیگر ممالک اور وہاں کے لوگوں تک پہنچانا ایک بڑی قومی خدمت ہے اور یہ فرض صرف اہلِ سندھ اور سندھی داں احباب کو ہی ادا کرنا ہے۔ جس سلسلے میں بعض انفرادی کوششیں کی جا چکی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا طریقہ انداز اور اسلوب، ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مجموعہ کلام 'شاہ جو رسالو' کے بعض حصوں کا انگریزی، فارسی اور اردو ترجمہ کیا جا چکا ہے اور ان کی اشاعت سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے متعلق غیر ممالک میں بھی کافی دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی دو سو گیارہویں برسی پر ان کے مجموعہ کلام 'شاہ جو رسالو' کا منظوم اردو ترجمہ صدر مملکت جنرل محمد ایوب خان کی خدمت میں پیش کیا گیا اور وہ ترجمہ صدر موصوف کے لئے باعثِ مسرت ثابت ہوا کیونکہ آپ نے کافی عرصہ پہلے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ علاقائی زبانوں کے تمام صوفی بزرگوں کے کلام کا پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے تاکہ ثقافتی اور تہذیبی یکجہتی اور اتحاد باہمی میں آسانی ہو۔

حضرت شاہ لطیف کا کلام جو بلحاظ شعر و فلسفہ دوسری علاقائی حیثیت سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے اسے دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے پیشِ نظر آج سے دس برس پہلے مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کی طرف سے سندھ یونیورسٹی کو مطلوبہ امداد مہیا کی گئی تھی تاکہ اس کی زیرِ نگرانی 'شاہ جو رسالو' کا منظوم اردو ترجمہ تیار کر کے زیرِ اشاعت لایا جا سکے۔

اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ علامہ آئی آئی قاضی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے لیکن سندھ یونیورسٹی کے بعض دانشوروں کی دانشوری کے باعث جن کی یہ دانشوری بذاتِ خود علامہ موصوف کی مرہونِ منت تھی کچھ ایسا ماحول پیدا ہوا کہ جناب علامہ صاحب کو یونیورسٹی سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی اور ان کی اس علیحدگی کا اثر شاہ جو رسالو کے منظوم اردو ترجمہ اور دیگر تعمیری اشاعتی پروگراموں پر پڑا۔

جناب علامہ موصوف نے تو یونیورسٹی سے علیحدگی اختیار کرنے کے فوراً بعد جا کر حضرت شاہ عبداللطیف پر تحقیقی کام شروع کر دیا اور اس وقت تک آپ کی دو کتابیں (۱) تالیف شاہ جو رسالو (۲) انگریزی میں 'شاہ لطیف کے فن کا تعارف' شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن شاہ جو رسالو کا یہ منظوم ترجمہ متواتر دس برس کے انتظار کے بعد بمشکل شائع ہوا ہے اور وہ بھی 'کھودا پہاڑ نکلا چوہا' کے مصداق۔ 'شاہ جو رسالو' کا منظوم اردو ترجمہ سب سے پہلے غالباً آغا تاج محمد پٹھان (سابق رجسٹرار سندھ یونیورسٹی) کے نام پر شائع ہو کر 'عکسِ لطیف' کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس کے بعد رشید لاشاری کا منظوم اردو ترجمہ 'روحِ لطیف'

کے نام سے پیش ہوا اور لطف اللہ بدوی نے بھی اس سلسلے میں چند قابلِ تحسین منظوم اردو تراجم پیش کئے اور ان حضرات کے علاوہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے سندھی شاعر نے بھی 'شاہ جو رسالو' کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہو لیکن ابھی تک کسی کی اشاعت کا مرحلہ نہیں آیا۔

مرکزی حکومت کی ہدایات پر سندھ یونیورسٹی کی طرف سے جو 'شاہ جو رسالو' کا منظوم اردو ترجمہ شائع ہوا ہے اس کے ابتدائی صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام میں کئی اہلِ علم حضرات نے حصہ لیا ہے مثلاً 'شاہ جو رسالو' کے متن کا اردو میں لفظی ترجمہ مخدوم امیر احمد (پرنسپل سندھ اورنٹیل کالج حیدرآباد) نے کیا۔ منظوم اردو ترجمہ مع ترتیب اور ابتدائی تعارف سندھ کے ترقی پسند شاعر شیخ ایاز نے تحریر کیا اور اس سلسلے میں سکھر کے اردو شاعر آفاق صدیقی نے شیخ ایاز کی مکمل قلمی اعانت کی۔ اسی طرح 'شاہ جو رسالو' کا مکمل سندھی متن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے تیار کیا اور شیخ ایاز کے اس منظوم اردو ترجمہ پر نظرِ ثانی جناب حفیظ ہوشیارپوری نے فرمائی اور اس کام کی تکمیل میں جناب پیر حسام الدین راشدی بھی اول سے آخر تک بڑی جانفشانی کے ساتھ مشیرِ کار رہے۔

یہ فہرست تعداد کے لحاظ سے 'شاہ جو رسالو' جیسی عظیم کتاب کے منظوم اردو ترجمہ کے اہم اور مشکل کام کے سلسلے میں اگرچہ بہت مختصر معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں چونکہ سندھی زبان کے برگزیدہ علما ادبا اور محققین کے ساتھ اردو زبان کے ممتاز شعرا نے بھی شرکت فرمائی ہے اس لئے 'شاہ جو رسالو' کے اس منظوم اردو ترجمہ کے ساتھ تمام اہالیانِ پاکستان کی بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن وائے افسوس!

ہماری ان تمام توقعات پر پانی پھر گیا جس کا اندازہ اسی منظوم اُردو ترجمہ کے ساتھ حسبِ ذیل اجمالی جائزہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

مقدمہ:

اس کتاب کا مقدمہ ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کے گیارہ عنوانات کے تحت حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی زندگی، ماحول، شاعری اور فلسفہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس منظوم اردو ترجمہ میں شیخ ایاز کو جو دقتیں اور رکاوٹیں پیش آئیں اور انہیں کیسے حل کیا گیا ان کا ذکر بھی موجود ہے۔

مقدمہ کے اس حصہ کا ماخذ ڈاکٹر گربخشانی کا مقدمہ اور ڈاکٹر سورلے کی انگریزی کتاب 'شاہ عبداللطیف آف بھٹ' ہے اور شاہ لطیف کے متصوفانہ نظریات، تاریخی پس منظر اور شاعرانہ ماورائیت کے ابواب میں بھی کوئی نئی بات تحقیقی جدت اور معلومات اضافی کا بھی کہیں نشان نہیں ملتا۔

عوامی کہانیوں کے باب میں بھی مرتب نے کسی محنت سے کام نہیں لیا۔ ورنہ انہیں چاہیئے تھا کہ اس سلسلے میں وسیع پیمانے پر تحقیقات سے فائدہ لیتے ہوئے ان عوامی داستانوں کو صحیح اور واضح روایات پر مرتب کرتے۔

اس کے علاوہ رسالہ کے مختلف سُروں (راگوں) پر 'ایک نظر' کے عنوان میں بھی شیخ ایاز سے بعض لغزشیں سرزد ہوئی ہیں اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے موسیقی کے علم اور سائنس کا مطالعہ نہیں کیا۔

'سُروں پر ایک نظر' میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ شیخ ایاز نے متعدد راگوں اور سُروں کے وجود ہی سے انکار کیا ہے۔ حالانکہ یہ سُر اور راگ سینکڑوں

برس سے ہماری موسیقی میں بڑی اہمیت کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔

ان راگوں کا سب سے پہلے سرِرام کلی پر اثر پڑا ہے جس کے متعلق شیخ ایاز کا کہنا ہے کہ سندھی خواہ کلاسیکی موسیقی کے نظام میں 'رام کلی' نام کا کوئی راگ ہی نہیں حالانکہ تقریباً ۵ ہزار سال سے لیکر یہ راگ اپنی سنجیدگی اور متانت کے باعث ہندی موسیقی میں ایک مشہور راگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'نارورن انڈین میوزک'، 'میوزک'، 'راگ مالا'، 'نغمات آصفیہ'، 'اسرار موسیقی'، 'سنگیت پرچہ' وغیرہ جیسی کتابوں میں بھی اس راگ کا ذکر سورت اور سرگم کے ساتھ موجود ہے۔

اس وقت اس راگ کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔ یہ راگنی 'بھیرو ٹھاٹھ' سے 'اوڈو سمپورن' ہے۔ 'آروہی' میں مدھم اور نکھار ورج ہیں۔ اس کا وادی دھیوت اور سموادی رکھب ہے۔ صبح کے پہلے پہر گائی جاتی ہے اور حمد و ثنا کے لئے مخصوص ہے۔

اسی طرح کی دوسری راگنی 'پوربی' ہے اس کے متعلق بھی فاضل مرتب نے یہ لکھا ہے کہ اس نام کی کوئی راگنی نہیں۔ حالانکہ ہندی سنگیت میں 'پوربی ٹھاٹھ' اسی راگنی سے قائم کیا گیا ہے۔

'کاموذ' راگ کے لحاظ سے 'کلیان ٹھاٹھ' کی راگنی ہے اور 'کھاڈو سمپورن' ہے لیکن سندھ میں اسے سمپورن گایا جاتا ہے۔

'سربلاول' کو شیخ ایاز نے 'کلیان ٹھاٹھ' کی راگنی بتایا ہے۔ حالانکہ راگ کے لحاظ سے یہ 'سُر بلاول ٹھاٹھ' کی راگنی ہے اور ان دونوں میں یہ نمایاں فرق موجود ہے کہ 'بلاول ٹھاٹھ' میں 'مدھم کومل' لگتا ہے اور اس میں 'وادی سُر' اکثر گندھار اور

سموادی دعبیرت ہوتا ہے جبکہ کلیان ٹھاٹھ میں نکھاد، اور رکھب، ترتیب وار وادی اور سموادی ہوتے ہیں۔ بلاول راگنی دس بجے صبح گائی جاتی ہے اور کلیان اول شام کو۔ باقی سروں مثلاً رانا، کوہیاری، کارایل، سمندوری اور سامونڈی وغیرہ گانے کے لئے ہمارے یہاں اپنی سندھی راگنیوں کی صورتیں موجود ہیں جو سروں کے کومل تیور کے لحاظ سے ایک الگ نظام قائم کرتی ہیں۔ ان راگنیوں کا ہم اگر سروں اور قوانین موسیقی کے مطابق جائزہ لیں تو ہمیں سندھی موسیقی کا ایک مکمل نظام معلوم ہو جاتا ہے۔

'سندھی دوہے کی ہیئت اور ماخذ' اور 'سندھی کافی اور اس کی ارتقا' کے دو ابواب میں بھی جو دعوے کئے گئے ہیں وہ مزید تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً جوگ اور بھگتی تحریک کی سندھ میں مقبولیت، شاہ کے شعروں پر ان تحریکوں اور ہندی کا اثر، خان خاناں کے شاعرانہ مزاج کا سندھی شاعری پر اثر اور ان کے دوہوں کی سندھ میں مقبولیت، تلسی داس، بھگت کبیر اور سوبر داس کے کلام کا سندھی شاعری کی ہیئت پر اثر انداز ہونا وغیرہ سب ایسی باتیں ہیں جن کی فرضی کہانیوں کی طرح کوئی اہمیت نہیں بلکہ شیخ ایاز ان کے متعلق اس دور کی سندھی شاعری کی کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکے ماسوائے سندھ کے ممتاز شاعر اور صوفی بزرگ شیخ عبدالرحیم گرہوڑی کا بھگتی اور جوگ تحریک کے خلاف جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمانا اور اسی طرح کے دوسرے متعدد تاریخی واقعات شاید شیخ ایاز کو معلوم ہی نہیں ورنہ بھگتی اور جوگ تحریک کی اسلام میں اہمیت کا دعویٰ ہرگز نہ کرتے۔

درحقیقت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے پہلے کا جو سندھی کلام اس وقت

تک محققین کی وساطت سے ظاہر ہو چکا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی کتاب 'سندھی زبان کی تاریخ' اور مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ کی کتاب 'کافی' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کا اس دور کی سندھی شاعری پر کوئی اثر نہ تھا۔

اس سلسلہ میں شیخ ایاز کی ایک قیاس آرائی صفحہ ۸۶ پر نمایاں ہے کہ "جناب شاہ لطیف صاحب نے سندھی کافی کا نام وائی کیوں رکھا؟ شیخ ایاز نے اس راز کا انکشاف یوں بیان فرمایا ہے کہ "جناب شاہ لطیف صاحب کے سب سے پہلے استاد میاں نور محمد بھٹی جو ہالا شہر میں رہتے تھے۔ وہ جناب شاہ صاحب کی سیرت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہالا چھوڑ کر 'وائی' نامی ایک گاؤں میں جا کر رہائش اختیار کی۔ یہ گاؤں جناب شاہ لطیف کے گاؤں 'بھٹ شاہ' کے بہت قریب تھا۔ میاں نور محمد کو چونکہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے قلبی تعلق تھا اور اسی تعلق کے باعث حضرت شاہ صاحب کی آمدورفت وائی گاؤں میں ہوا کرتی تھی لہٰذا ممکن ہے کہ وائی میں جو لوک گیت گائے جاتے ہیں شاہ صاحب نے انہیں کسی ذہنی محرک کی طرح قبول کر لیا ہو اور اسی طرح اپنے گیتوں کا نام بھی 'وائی' منتخب کیا ہو۔"

شیخ ایاز کی مذکورہ عبارت کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ کوئی دانشور یا ذہین طالب علم بھی علمی ادبی تحقیق کے سلسلے میں ایسی بات نہیں لکھ سکتا جو شیخ ایاز نے لکھی ہے اور تعجب ہے یہ مضحکہ خیز بات سندھ کے جلیل القدر علما اور فضلا کی نظر سے گزر کر شائع بھی ہو چکی ہے۔

ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید سندھی زبان کی ادبی تحقیق کا معیار اس

قدر پست ہو گیا ہے کہ ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کے اس دور میں ان کا ایک معتقد بھی ایسی بہکی ہوئی باتیں کر رہا ہے۔

اس کے بعد ’شاعری اور تنقید‘ کے عنوان کے تحت یورپ کے چند علما کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ان کا ’شاہ جو رسالو‘ پر کیا اطلاق ہو سکتا ہے؟ اس کی وضاحت کے متعلق کچھ لکھنا شاید شیخ ایاز کو یاد ہی نہیں رہا۔

اسی عنوان سے ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید شاہ لطیف کی شاعری پر سندھ کے اس نوجوان شاعر نے کسی نئے زاویہ نگاہ سے تنقید کی ہے اور ’شاہ جو رسالو‘ کے وہ پہلو جو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے انہیں اس نوجوان نے جدید علم کی روشنی میں دیکھ لیا ہے اور شاہ صاحب کے کلام سے متعلق اب تک منظر عام پر آئی ہوئی نگارشات کے مطابق اسے جو مایوسی ہوئی تھی اسے دور کرنے کے لئے کوئی نئی راہ نکالی ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ شیخ ایاز کو ڈاکٹر گربخشانی، ڈاکٹر سورلے، علامہ آئی آئی قاضی اور مسز ایلسا قاضی کے علاوہ اور کوئی معتبر اور حضرت شاہ لطیف کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھنے والا دوسرا کوئی محقق ہی نظر نہیں آیا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ’شاہ جو رسالو‘ کے اس منظوم اردو ترجمہ میں نہ تو کہیں علامہ آئی آئی قاضی کا کوئی مقولہ نظر آتا ہے اور نہ ان کے پیش کردہ فلسفہ سے شیخ ایاز صاحب متاثر ہوئے ہیں۔ کیونکہ علامہ موصوف کے نظریات سے یہ منظوم ترجمہ اتنی ہی دوری کا حامل ہے جتنا فاصلہ ان دونوں کی علمی وسعت اور تحقیقی تدبر میں نظر آتا ہے۔

ترجمہ کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے جناب مترجم صاحب فرماتے ہیں

کہ ”اردو زبان میں الفاظ کا ذخیرہ بالکل محدود ہے لہٰذا شاہ کا کلام اصل معنی اور مفہوم کے مطابق اردو میں ترجمہ کرنا بہت دشوار ہے۔“

اردو زبان میں وسعتِ الفاظ کا دائرہ محدود ہے یا نہیں، لیکن شیخ ایاز کا ترجمہ نہ صرف محدود نظر آتا ہے بلکہ حضرت شاہ لطیف کے معنی، مطالب اور فلسفہ سے بھی کوسوں دور ہے۔ رموز روحانیت سے لبریز اور محاسن معنوی سے ہمکنار ’شاہ جو رسالو‘ منظوم اردو ترجمہ کی صورت میں منتقل ہونے کے بعد نہ تو ’رسالو‘ رہا ہے اور نہ اس میں آیاتِ قرآنی کے اقتباس کے ساتھ معنوی ابیات کا خزانہ۔

شاید یہ ازرا پاؤنڈ کے فلسفہ کا اثر ہے کہ ’رسالہ‘ کے ابیات کی ہیئت اردو ترجمہ میں قائم نہیں رہ سکی۔ ’نوری۔ جام تماچی‘ کا قصہ جو شاہ لطیف کے الفاظ میں سورہ اخلاص کے اقتباسات کے ساتھ بندہ و خالق کے رشتۂ حقیقت کی تفسیر ہے، اسے بھی ماشاءاللہ نہایت عمدہ پیرایہ میں صرف دنیوی عاشق و معشوق کا مکالمہ کر کے پیش کیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ میں مستعمل تشبیہات اور محاورات میں عامیانہ طرزِ خطابت حضرت شاہ عبداللطیف کی روح کے لئے باعثِ رحمت تو نہیں ہو سکتے بلکہ انہیں موجودہ جنسیات زدہ معاشرہ کے عام رجحانات کی عکاسی ضرور کہا جا سکتا ہے۔

تاریخ سندھ کا ماخذ

سید حسام الدین راشدی نے مرحوم مولانا دین محمد وفائی کی کتاب ’شاہ کا مطالعہ‘ کے پیشِ لفظ میں لکھا ہے کہ ”شاہ بھٹائی کا رسالہ سندھ کی تاریخ کا

کا کافی سواد مہیا کرتا ہے اور اسی طرح شاہ کا رسالو سندھی شاعری کی معراج کے علاوہ سندھی زبان بھی سندھ کی تاریخ بھی ہے۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ اپنی قوم کی زندگی تہذیب اور ادب کا ترجمان ہوتی ہے لیکن یہ منظوم اردو ترجمہ نہ تو سندھ کی تاریخ کی عکاسی کرتا ہے اور نہ سندھی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی۔

متن

مقدمہ کے بعد ہم شاہ جو رسالو کے متن اور منظوم اردو ترجمہ کے متعلق عرض کرتے ہیں۔

رشاہ جو رسالو کی ابتدا حسب ذیل بیت سے ہوتی ہے:

اوّل اللہ علیم، اعلیٰ، عالم جو دھنی
قادر پنہنجی قدرت سیں قائم آہ قدیم

(اللہ اول، علیم، اعلیٰ عالم کا دھنی (مالک الملک) ہے۔ وہ قادر اپنی قدرت سے قائم (قائم بالذات) اور قدیم ہے)

اس بیت میں شاہ صاحب نے اسلام اور تصوف کے اس فلسفہ کو ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اول ہے اور علیم ہے یعنی وہ ہر چیز کا منبع و مرکز ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ یعنی منبع و مرکز صرف وہی ہستی ہو سکتی ہے جس کو دوسری تمام چیزوں کا علم ہو۔ جناب شاہ صاحب نے اس فلسفہ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی صفت 'علیم' سے کیا ہے لیکن شیخ ایاز کے منظوم اردو ترجمہ میں شاہ کی اس سطر کا منظوم اردو ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے۔

'تیری ہی ذات اوّل و آخر ہے'

غور فرمائیے 'علیم' کی بجائے 'آخر' کی صفت استعمال کی گئی ہے یعنی شیخ ایاز کے ترجمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اول تو ہے لیکن 'علیم' نہیں اور علیم نہ ہونے کی حالت میں ہم اللہ تعالیٰ کو جملہ موجودات کا منبع و مرکز ہرگز قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ کوئی بھی چیز اول ہونے کی حالت میں خود جیسی ایک دوسری چیز کی بھی محتاج بن سکتی ہے اور ان دونوں چیزوں کے ملاپ کو کیمیائی ملاپ کہا جاتا ہے اور اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ہستی کو کیمیائی اجزاء کا مجموعہ مان لیں تو پھر یہ ثابت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اوّل تو ہے لیکن اس میں دوسری قوتوں کو جذب کرنے کی کوئی صلاحیت موجود نہیں۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب نے اوّل اور علیم کی صفات بطور لازم و ملزوم استعمال کی ہیں اور علیم کی صفت نہ لانے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب کا فلسفہ وحدۃ الوجود بالکل ختم ہو جاتا ہے جس میں پورے شاہ جو رسالو کا راز پنہاں ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے بیت کی دوسری سطر یہ ہے ؎

قادر پنہنجی قدرت سیں قائم آہ قدیم

(قادر اپنی قدرت سے قائم اور قدیم ہے) یعنی اللہ تعالیٰ بالذات اور قدیم ہے۔ وہ اپنی قوت منفردہ سے قائم ہے اور اس کی ذات کو کسی کیمیائی تحلیل کی ضرورت نہیں اور اس کی ذات مادہ سے بے نیاز ہے۔

اسی طرح حضرت شاہ صاحب کے اپنے اس بیت کی آخری سطر ملاحظہ فرمائیے ؎ کرے پانڑ کریم، جوڑوں جوڑ جہاں جی

(وہ کریم خود ہی اس جہاں کی پرورش در پرورش کا ضامن ہے) یعنی اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اپنے اس بیت کی اس آخری سطر میں اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے کی مزید صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ اُس نے اس دنیا کو پرورش در پرورش کے اصول پر تخلیق فرمایا ہے یعنی بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے کہ اس کی ماں کا دودھ پہلے ہی سے تیار ہونے لگتا ہے۔ الغرض ہر ایک ذی رُوح کے لئے اس دنیا میں آنے سے پہلے اس کے رزق کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن نئے لکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ انسان اور دوسری ذی رُوح اشیاء کے رزق کے ذرائع ان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود نہیں ہوتے اور بعد میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ انسان کی کوششوں پر اور محنتوں پر منحصر ہے اور اس قادر کریم کی پرورش در پرورش اور کرم نوازی کا تصور بالکل فضول ہے۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا یہ سندھی بیت جس میں اسلام کے فلسفہ ربوبیت کو کوزے میں دریا بند کرنے کی حالت میں پیش کیا ہے اس کا منظوم اردو ترجمہ صرف ان الفاظ میں کرنا کہ :-

والی شش جہات ، واحد ذات
رازق کائنات، رب رحیم

آخر کہاں کا انصاف ہے۔ ہمیں تو اس منظوم اُردو ترجمہ میں کوئی فلسفہ نظر نہیں آتا۔ بس! صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شش جہات کا والی، واحد، کائنات کا رازق رب اور رحیم ہے جو ایک بچہ بھی جانتا ہے لیکن شاہ

صاحب کے بیت کا آخری مصرع

کرے پانڈ کریم ، جوڑوں جوڑ جہان جی

میں جو راز پنہاں ہے اسے کیوں حذف کر دیا گیا ہے۔ اب آپ شاہ صاحب کا اصلی بیت ملاحظہ فرمائیے۔

اول اللہ علیم ، اعلیٰ ، عالم جو دھنی
قادر پنھنجی قدرت سیں ، قائم آہ قدیم
والی ، واحد ، وحدہٗ ، رازق ، رب ، رحیم
سو ساراہ سچو دھنی ، چئی حمد حکیم
کرے پانڈ کریم ، جوڑوں جوڑ جہان جی

اللہ اول علیم ، اعلیٰ ، عالم کا دھنی (مالک الملک) ہے۔ وہ قادر اپنی قدرت سے قائم اور قدیم ہے۔ وہ والی ، واحد ، وحدہٗ ، رازق ، رب اور رحیم ہے۔ تو اس سچے مالک کی تعریف کر اور اس حکیم کی حمد بیان کر۔ وہ کریم خود ہی اس جہاں کی ایک جوڑ سے دوسری جوڑ جوڑتا ہے (یعنی وہ پرورش در پرورش کا ضامن اور مسبب الاسباب ہے)

اب اس منثور لفظی ترجمہ کی روشنی میں شیخ ایاز کے منظوم اردو ترجمہ پر بھی غور فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

تیری ہی ذات اوّل و آخر	تو ہی قائم ہے اور تو ہی قدیم
تجھ سے وابستہ ہر تمنا ہے	تیرا ہی آسرا ہے ربّ کریم
کم ہے جتنی کریں تری توصیف	تو ہی اعلیٰ ہے اور تو ہی علیم

دائی شش جہات، واحد ذات　　رازق کائنات، رب رحیم

اگرچہ اس منظوم اردو ترجمہ میں 'علیم' کا لفظ بھی ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس صفت کو چونکہ اللہ کی صفت مقدم اول سے بالکل الگ کیا گیا ہے اور 'اول' و 'علیم' کی ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کی نسبت قائم نہیں رہی اس لئے اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ موجودات کا منبع و مرکز ثابت ہونے کا فلسفہ کہیں بھی نظر نہیں آتا اور اللہ تعالیٰ کی ہستی قائم بالذات کی بجائے مادہ کی طرح قائم بالغیر اور کیمیائی تحلیل کا مجموعہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے دوسرے بیت میں توحید باری تعالیٰ کے بعد نور محمدی کا خاص فلسفہ پیش کیا ہے یعنی صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ نور محمدی ہی ہر چیز کا منبع ثانی اور ظہور کائنات کا سبب ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوتا ہے۔ "لولاک لما خلقت الافلاک"

یعنی اے محمدؐ! میں اگر تمہیں پیدا نہ کرتا تو آسمان بھی پیدا نہ کرتا۔

اب ذرا شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اصل سندھی بیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے، فرماتے ہیں۔

'وحدہٗ لاشریک لہٗ' جاں تھو چئیں ایں
تا منّج محمّد کارنی نر توں منجھاں نینہہ
تا توں وِنجیں کِئیں؟ نائیں سر بین کھے

(ترجمہ: جب تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں تو محمدؐ کو بھی شوق وصدق دل سے (تخلیق کائنات کا) کارن (سبب) تسلیم کر۔ اس

بات کے باوجود تو دوسروں کے سامنے کیوں سر جھکاتا ہے۔

یعنی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ توحید باری پر ایمان لانا تب تک مکمل نہیں جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صدق دل سے باعث تخلیق کائنات تسلیم نہ کیا جائے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے اپنے اس بیت میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں ۔۔　　تا توں وِنجیں کِئیں، نائیں سر بین کھے

یعنی تیرے پاس اسلام جیسا فطری اور عالمگیر مذہب موجود ہے تو پھر دوسرے مذاہب میں پناہ کیوں ڈھونڈتا ہے اور سر جھکاتا ہے۔ لیکن شیخ ایاز نے حضرت شاہ لطیف کے اس ذو معنی بیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

اگر اللہ پہ رکھتے ہو ایمان　　رسول اللہ سے بھی لو لگاؤ
سمائے جس میں ان دونوں کا سودا　　کسی در پہ نہ اس سر کو جھکاؤ

کیا ایک معمولی سی بات تھی کہ جسے بازاری شاعروں کی طرح اردو میں منتقل کرکے ایاز صاحب ایک بڑے قومی فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔

'لو لگاؤ' لفظوں میں حب رسول اور 'محمد کارنی' (محمد باعث تخلیق کائنات ہیں) کا مفہوم کہاں ادا ہوتا ہے اور حضور اکرمؐ کے نبی اور پیغمبر ہونے کی صفت کہاں، کدھر، کس طرح اور کیوں اس ترجمہ سے غائب کردی گئی ہے۔ کیونکہ

سمائے جس میں ان دونوں کا سودا
کسی در پہ نہ اس سر کو جھکاؤ

بالکل مہمل، بے معنی اور اردو زبان کا نہایت کمزور شعر ہے۔

عمر کا کردار

شاہ صاحب نے اپنے رسالہ میں تمثیلی طرح کی جو عوامی کہانیاں بیان فرمائی ہیں ان میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آپ کی ہر ایک کہانی میں ہیروئن کا نام ہیرو سے پہلے آتا ہے کیونکہ شاہ لطیف کی ہر ہیروئن کا کردار اپنے ہیرو کے مقابلے میں بہت بلند ہے۔ مثلاً سسی پنوں، سوہنی مہینوال، لیلا چنیسر، نوری جام تماچی اور سورٹھ، رائے ڈیاچ۔ لیکن 'ماروی' کی داستان کا عنوان 'عمر ماروی' ہے اور نہ 'ماروی عمر' جیسا کہ دوسری کہانیوں کے عنوان میں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح شاہ کی ہیروئن کا کردار اعلیٰ ہے اسی طرح ایک کہانی کے ہیرو کا کردار بھی بہت اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ ہیروئن کے نام سے پہلے اس کا نام آتا ہے۔ ازاں سوائے شاہ صاحب نے کسی ولن کا نام کہانی کا عنوان نہیں بنایا اور نہ کسی ایسے کردار کی تعریف کی ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سامنے سندھ کے بادشاہ عمر سومرو کا کردار بالکل اونچا اور توصیف و تعریف کے قابل ہے جس طرح لیلیٰ اپنے کردار کی کمزوری کے باوجود ہیروئن ہے اسی طرح عمر بادشاہ بھی ہیرو ہے۔

عمر سے بے شک غلطی سرزد ہوتی ہے کہ وہ انسانی کمزوری سے مجبور ہو کر ماروی کو زبردستی اُٹھا لاتا ہے لیکن صاحب سطوت اور مالک سلطنت ہونے کے باوجود ماروی کے ساتھ کسی قسم کے ظلم اور زیادتی کا برتاؤ نہیں کرتا۔ اپنی کوششوں کے ذریعے اس سے شادی کرنے میں جب اسے ناکامی نظر آتی ہے تو وہ ماروی کو

باعزت و عصمت اپنے گاؤں ملیر واپس بھیج دیتا ہے۔ اگر ماروی اہالیانِ سندھ کے لئے حب الوطنی کی مثال ہے تو عمر سومرو کا کردار بھی سندھی تہذیب میں ضبطِ نفسی اور خدا ترسی کی ایک زندہ مثال پیش کرتا ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جس خوش اسلوبی سے اس داستان کو شعریت کا جامہ پہنایا ہے اس میں کہیں بھی اور کسی بھی طرح سرمایہ داری اور طبقاتی کشمکش ظاہر نہیں ہوتی۔ ہم اگر اس وقت کے تاریخی حوادث اور معاشرتی واقعات کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ ماروی جیسی عورتوں کو زبردستی اٹھا لانے کے واقعات تو بہت ملیں گے لیکن عمر کی طرح ماروی کو باعصمت واپس کرنے کا واقعہ کہیں بھی نظر نہیں آئے گا گویا یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت شاہ صاحب نے عمر سومرو کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

توکھے توڑائیں لکھی ، عمر اجھائیٔ
جا تو سام آئی ، سام نہ بھگئے ماڑئیں

یعنی اے عمر! تیرے لئے ازل ہی سے پاک دامنی لکھی تھی کیونکہ جس نے تیرے یہاں سہارا لیا تو نے اس کے مارو قبیلے کی عزت کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

جس عمر کے مقدر میں روزِ ازل سے پاک دامنی لکھی گئی ہو اور اس نے اپنی زیرپناہ عورت کے راز کو افشا نہ کیا ہو اور اس کی عصمت کو برقرار رکھا ہو وہ ضرور صاحب اخلاق شخص ہوگا لیکن شیخ ایاز سے حسب دستور یہ عالم آشکارا حقیقت بھی پوشیدہ رہی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ماروی جب عجز و انکساری کے لہجہ میں عمر سومرو سے یہ کہتی ہے ؎

عمر وہ ءِ نہ عاق ، ڈکھیا جم ڈکھوئیں

یعنی اے عمر! وہ تیرے نافرمان نہیں ہیں۔ مبادا تو ان دکھی انسانوں کو کوئی دکھ پہنچائے۔

تو شیخ ایاز صاحب دھڑے سے شاہ کے اس شعر کا منظوم اردو ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ؎ مگر ظالم ہو اتنے اے عمر! تم

کہ یہ مظلوم سینہ چاک ہیں سب

ماروی کے شکوہ میں تو یہ بات ہے کہ اے عمر! تو کسی کو دکھ پہنچانے والا نہیں مبادا غلطی اور بے خبری کی وجہ سے تو ان خانہ بدوشوں کو دکھ پہنچائے کیونکہ وہ تیرے نافرمان تو نہیں۔ لیکن شیخ ایاز نے شاہ لطیف کے اس شعر کا مفہوم ہی کچھ اور سمجھا ہے۔ شاہ کے اس سندھی بیت میں ظالم و مظلوم کا انداز منافرت اور موجودہ سیاسی کشمکش کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ بلکہ اس شعر میں شاہ صاحب نے سرمایہ داری نظام کی مخالفت اور غریبی و مفلسی کی حمایت کے متعلق کوئی فلسفہ پیش نہیں کیا۔ اگر ان الفاظ کو توڑ مروڑ کر اور معنی و مفہوم کو کھینچ تان کر فلسفۂ مادیت کا پروپیگنڈہ مقصود تھا تو پھر جس طرح اردو ادب کے ترقی پسند احباب نے نظیر اکبر آبادی کے کلام میں روٹی اور بھوک کا ذکر دیکھ کر اسے ہندوستان کا سب سے پہلا انقلابی اور ترقی پسند شاعر قرار دیا ہے۔ اسی طرح سندھی دان حضرات کو بھی فوراً یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بزرگی کو چھوڑ دو اور ان کے کلام میں روحانیت مت ڈھونڈو۔ وہ تو مادیت پرست تھے اور انہوں نے بھی اپنے زمانے میں ہیگل اور مارکس کی طرح مادی فلسفہ کا پرچار کیا ہے۔

بلکہ اس نظریہ کے لوگوں کو اپنی نظریاتی تقویت کے لئے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کا سہارا لینا چاہیئے کیونکہ شاہ ولی اللہ کے بعض معتقد اسی خیال کے حامی ہیں کہ "شاہ ولی اللہ ہندوستانی مارکس تھے اور ان کی تعلیم اور فلسفہ کا اثر مخدوم محمد معین ٹھٹوی کی وساطت سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر پڑا۔"

اس موقع پر بے جا نہ ہوگا کہ ہم شیخ ایاز کی توجہ سندھ کے سائیں کے تحریر کردہ ایک مضمون کی طرف مبذول کرائیں جو کہ انہوں نے دردِ دل، پاکیزگی ذہن اور لطافت قلب کے ساتھ، سندھ کی لازوال محبت سے سرشار ہو کر لکھا محترم جی ایم۔ سیّد فرماتے ہیں کہ:-

"اطمینان قلب انسانی عبادت کی آخری معراج ہے۔ حق، صبر، شکر، خوف خدا، انصاف اور صداقت اطمینانِ قلب کے مختلف مظہر یا روپ ہیں۔ یورپ والوں کو دوسری تمام نعمتیں میسر ہیں لیکن انہیں اطمینانِ قلب حاصل نہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہے؟ عمدہ لباس کے باوجود جن، چور اور حیوان کی صورت لئے پھرتے ہیں ہر بیس برس کے بعد باہمی نزاع اور تباہی۔ پتہ نہیں چلتا کہ آخر ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ قطب نما کی سوئی ہیں اور قطب ضائع کرنے کے بعد مضطرب اور پریشان، ایک مجسم ماہی ہیں اور آب کی عدم موجودگی کے باعث ہر دم تڑپ رہے ہیں۔ روحانی پہلو ان کی زندگی سے خارج ہو چکا ہے اور جنگلی جانوروں کی طرح ان کی زندگی صرف پیٹ کی پوجا میں صرف ہوتی ہے یعنی جسم فربہ روح ندارد۔

ڈیل ڈسی مَ ڈر ، اندر مڑیوئی اگڑیوں

یعنی صرف موٹاپا دیکھ کر مت ڈر، جسمانی توانائی کھوکھلا پن ہے۔

یورپ والوں کے مقابلہ میں خدارا سندھ کی تاریخ اور سندھی لٹریچر کا تجزیہ کیجئے۔ دیکھئے آپ کو کیا نظر آتا ہے؟ اس میں جسم اور گوشت کی خوشنودی سے زیادہ روح کی راحت پر زور دیا گیا ہے۔ سندھ کے اساتذہ اور پیشواؤں نے ہمیں کیا تعلیم دی ہے اور انہوں نے ہمیں کس رنگ میں رنگا ہے۔

عالم اسلام سینکڑوں برس کی کوشش سے صرف ایک رومی پیدا کر سکا لیکن سندھ کے جس شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس میں آپ کو رومی کی روح نظر آئے گی یعنی دنیا کے لئے رومی کا درس ایک انوکھی، غیر معمولی اور عجیب چیز تھا۔ ایک ایکسیڈنٹ تھا۔ ایک ایسا واقعہ جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی لیکن سندھ کے گھر گھر میں رومی پیدا ہوا۔ نہ صرف ہر دور اور ہر صدی میں بلکہ ہر برس میں ایک نہ ایک رومی، سندھ میں روح کی اصلاح کرتا رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روح کو اُجاگر کرنے کا کام سندھ کی ایک امتیازی خصوصیت تھی اور یہ سندھ کی تعلیم اور زندگی کا ہی خلاصہ تھا جس نے جسم کو پست اور روح کو اونچا رکھا۔

کاش! اگر دنیا بھی اس راہ پر چلتی اور سندھ سے سبق حاصل کرتی تو شاید آج آشا خون خرابہ نہ ہوتا اور دنیا جہنم اور قتل گاہ نہ بنتی بلکہ اطمینان اور نیکی کا ایسا بہشت جس میں رہنے کے لئے فرشتوں کو بھی حسرت ہوتی۔

بہرحال شاہ جو رسالو کا یہ منظوم اردو ترجمہ شیخ ایاز اور ان کے شریک کار آفاق صدیقی کی حضرت شاہ لطیف بھٹائی کے فلسفہ اور پیغام وحدت سے لاعلمی کی ایک زندہ مثال ہے۔

کاش! اس ترجمہ کے متعلق اگر یہ کہا جاتا کہ یہ شیخ ایاز کے اردو کلام کا مجموعہ ہے تو ان پر صرف یہ الزام عائد ہوتا کہ انہوں نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا غیر دانشورانہ انداز میں چربہ اُتارا ہے لیکن موجودہ حالت میں تو اسے قومی المیہ اور شاہ لطیف بھٹائی سے دشمنی کی واضح مثال کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(ہفت روزہ "جھنکار" کراچی، ۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء)

—OOO—

ابیات سندھی کا ادبی تجزیہ

سندھی شاعری کے اُفق پہ بارھویں صدی ہجری کے آخری عشرہ میں ایک تابناک ستارہ طلوع ہوا جس کی ذات ولایت اور شاعری کا معتبر اور مقدس ملاپ تھی۔ یہ بزرگ سلطان الاولیا خواجہ محمد زمانؒ تھے جن کے اجداد خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں ۱۷۰ھ میں عرب سے ہجرت کر کے ٹھٹھہ میں آباد ہوئے۔ یہ پُرآشوب دور تھا۔ سندھ کے دو حکمران خاندان سمہ اور سومرا باہم برسرِ پیکار تھے۔ چنانچہ اس داخلی بدامنی کی وجہ سے شہر برباد ہونے لگا تھا جس کی وجہ سے یہ خاندان بھی سندھ کو خیرباد کہہ کر کچھ منتقل ہو گیا لیکن ان کا روحانی رشتہ سندھ سے ٹوٹ نہ سکا اور ۱۵۰۴ء میں شیخ عبداللطیف کبیر اپنے سندھی مریدوں کی منت سماجت کی وجہ سے واپس ٹھٹھہ آ گئے۔

جب خواجہ صاحب کے اجداد سندھ میں آئے تھے اس وقت عربوں کی حکومت تھی اور اگر وہ چاہتے تو انہیں بڑے سے بڑا منصب مل سکتا تھا لیکن انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ وہ اور ان کی اولاد نہ کبھی حکومت کریں گے اور نہ ہی حکومت کا کوئی عہدہ قبول کریں گے۔ ان کی زندگی سادگی اور تحمل و تواضع کا نمونہ تھی۔ انہیں اگر کوئی شیخ یا پیر کہتا تو ناراض ہو جاتے تھے۔ گو اس زمانہ میں بھی ان کے مریدوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔

حضرت سلطان الاولیا ۱۲ر رمضان المبارک ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ قدیم تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بچپن ہی سے ربِّ کریم سے محبت تھی۔ اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں قرآن مجید حفظ کیا اور ٹھٹھہ کے ایک نہایت ہی متبحر عالم مخدوم محمد صادق نقشبندی کے مدرسہ میں دینی علوم کی تحصیل مکمل کی۔ خواجہ صاحب نہایت ہی تیز فہم تھے اور دن رات محنت کر کے نوجوانی میں ہی شرعی علوم میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

اسی دوران آپ مخدوم ابوالقاسم نقشبندیؒ کے معتقدوں میں شامل ہو گئے اور مخدوم آدمؒ کے پوتے اور اپنے والدِ محترم کے دوست خواجہ ابوالمساکینؒ میاں محمد کی خدمت میں رہتے ہوئے درجہ بدرجہ طریقت کے بحر میں سے مشاق تیراک کی طرح اسرار و رموز کے موتی نکالتے رہے اور یوں تصوف میں کمالیت پانے کے بعد خلافت کا خرقہ حاصل کیا اور جب حضرت ابوالمساکینؒ ہجرت کر کے مکہ گئے تو خواجہ صاحب کو سندھ و ہند میں اپنا جانشین مقرر کر گئے۔

سندھ میں نقشبندی مکتبۂ فکر گیارہویں / بارھویں صدی ہجری میں پھیلا۔ زیریں سندھ میں مخدوم ابوالقاسمؒ درس نقشبندی اور مخدوم آدمؒ اور بالائی سندھ میں مخدوم محمد اسماعیلؒ پریالوی جن سے راشدی خاندان کے جدِ امجد حضرت محمد بقا شاہؒ اور پیر محمد راشدؒ نے فیض حاصل کیا اس سلسلے کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی سرہندی (متوفی ۱۰۳۴ھ) کے فیوض و برکات کے سندھ میں جاری و ساری ہونے کا بیان آپ کے مکتوبات نیز روضۃ القیومیہ، مکتوباتِ معصومیہ اور مکتوبات سیفیہ (فارسی)

میں آیا ہے۔ بہرحال جو شہرت سلطان الاولیاء کو حاصل ہوئی وہ اس دور کے کسی بزرگ کو سندھ میں حاصل نہ ہو سکی۔ دُور دُور سے علما اور صلحا آپ سے نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

نقشبندی سلسلے میں تزکیہ نفس کے لئے شریعت کی سخت پابندی، ذکرِ خفی اور مراقبہ کرنا، مذہبی احکامات رائج کرنے کے لئے منظم طور پر کوشش کرنا، اہم اصول ہیں اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ یہ بزرگانِ نقشبندیہ کے فیوض و تعلیمات کا ہی نتیجہ تھا جو برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے تشخص کا احساس بیدار ہوا۔ کیونکہ وحدت الوجود کے فروغ کے نتیجے میں ہمارے یہاں "ہندو مسلم بھائی بھائی" یا ایک قومی نظریہ کی بنیاد پڑی تھی۔ لیکن شیخ سرہندیؒ کے فلسفۂ وحدت الشہود نے برطانوی ہندوستان میں "دو قومی نظریہ" کی داغ بیل ڈالی۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر برطانوی ہند کے مسلمانوں نے اپنی سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا اور انگریز اور کانگریس کی بساط کو الٹ دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب سخت مجاہدہ اور ریاضت کے عادی تھے۔ فجر کے بعد سے چاشت تک مسلسل مراقبہ میں رہتے تھے اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ سینکڑوں رشد و ہدایت کے طالب جذب اور بے خودی میں گم رہتے تھے۔ شب بیداری ان کا معمول تھا اور لوگوں کو سوتا ہوا دیکھ کر تعجب فرماتے تھے کہ یہ لوگ اپنی زندگی کس طرح ضائع کرتے ہیں۔ شریعت کے سخت پابند تھے اور فرماتے تھے کہ "اگر آج مستحب ترک کرو گے تو کل سنت ترک کرنے پر آمادہ ہو گے۔ اس کے بعد ترک فرض کی نوبت آئے گی۔ اور ترک فرض بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے۔"

خواجہ صاحب نے اپنے باطنی فیض سے سارے سندھ اور کچھ کے علاقے کو فیضیاب کیا اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ کی روحانیت کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ خواجہ صاحب ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مجسمہ تھے اور شریعت اور طریقت کی تمام فضیلتوں پر فائز تھے۔ ان کی گفتگو نہایت سنجیدہ، مختصر اور پُر معنی ہوتی تھی۔ راضی برضا، توکل، صبر، سخاوت، بے اسبابی اور گوشہ نشینی آپ کے کردار کی خوبیاں تھیں۔ شاعر کی حیثیت سے "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق وہ روشن ضمیر اور ہدایتوں کا سرچشمہ تھے۔

خواجہ صاحب نے اپنی شاعری کو باقاعدہ اسلامی تصوف کے دائرہ میں لاکر طائرِ فکر کو نئی پرواز بخشی۔ سندھ کی قدیم شاعری میں خواجہ صاحب کے ابیات ہی تمام تر تصوف کے تانے بانے ہیں۔ دوسرے شاعروں مثلاً میوں لطف اللہ قادری، میوں شاہ عنات رضوی اور حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ کی طرح انہوں نے عوامی داستان یا دنیوی قصے کہانیاں بیان نہیں کی ہیں۔ آپ کے کلام کا موضوع فنا اور وصل کا فلسفہ ہے اور ادبی اور اخلاقی، روحانی اور فنی لحاظ سے سندھی ادب میں اس کا اعلیٰ مقام ہے۔ آپ کے عارفانہ ابیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب علمِ لدنی سے نوازے گئے تھے۔ وہ عارف باللہ تھے۔ صلاحیت، شرافت، فہم و فراست کی تابندہ مثال تھے۔ بصیرت اور درایت کے علاوہ ان کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا تھا۔ اب سلطان الاولیا کے چند ابیات ملاحظہ فرمائیں۔

جھڳ تنين جي جاءِ جنين ڇڏي ڄڳ کي
سپي تو سڌ اءِ جي تو سڌ نه تن سين

یہ جگ اُن اہلِ ہمّت کی جگہ ہے　　جنہوں نے آپ اس دنیا کو چھوڑا
لبھائیں گے سبھی تم کو ولیکن　　نہ تم ہرگز کسی سے دل لگانا

یہ بات مولانا رُومیؔ نے بھی کہی ہے ؎

چیست دنیا ؟ از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

حقیقت میں یہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا ہے کہ "اے مسلمانو! تمہارے مال وزر اور اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل کردیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ سراسر نقصان اٹھائیں گے۔"

جَاهِلَ جُنگُ سُکَنِ جو ، عَارِفَ سُوُرُ سُهاءِ
سُورَن سَندِي سَاۡءِ ، راحَتَ رَسي رُوحَ کي

جاہل کو سکھ پسند ہے، عارف کو دکھ پسند
اس دکھ کے ذائقے میں راحت ہے روح کی

سَجَڻُ ڏِٺوجَنِ ، تَنِ ڏِسَڻُ غيرُ گنَاهُ
جَنِين لَڌي رَاهَ ، وِهُ تِنين وِهُ ٿِيو

آنکھوں میں جس کی جلوۂ محبوب بس گیا
اس کو گناہ ہے جانبِ اغیار دیکھنا
قسمت کی یاوری سے جسے راہ مل گئی
پھر اس کے حق میں زہر ہے آرام راہ کا

جَنِي مَحَبَّتَ مَنجِهُ مُئا ، سي مُورِ نہ مَرَنِ کَڏهِمُ
مَنْ قَتَلَتُهُ فَاَنَا دِيَتُهُ ، وَڏِيا مُـلَّ وِـٺـا

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ، وَجي مُوتَ وِهاءِ
مُرَتا اَڳي ماءِ ، آڳاهون اسلامُ ٿيـو

جو محبت میں مرتے ہیں وہ لوگ
فی الحقیقت کبھی نہیں مرتے
خوں بہا میں ملے گا خود محبوب
بڑی قیمت پہ وہ یہاں سے گئے

حق کے نزدیک دین ہے اسلام
مرتے دم تک نہ اس کا ساتھ چھٹے
موت آگے تری نظر کے رہے
اور اسلام اس سے بھی آگے

لَڳو واءُ وِصَالَ ، جَنِين سَاعت هيڪڙي
تِنِ سالڏِي لال ، جنهن لئہ جَڳُ خَلِقيو

جن کو پل بھر لگی ہو بادِ وصال
اُن کی خوش بختیوں کا کیا کہنا
وہ جواہر انہوں نے پائے ہیں
جن کی خاطر بنی ہے یہ دنیا

خانوادہ لواری کے ایک دانشور محترم پروفیسر پیر سعید حسن صاحب نے پوری شرح و بسط سے ابیات کو مدوّن کیا۔ ابیات کا اردو منظوم ترجمہ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے کیا ہے جو سندھ یونیورسٹی میں اُردو کے استاد ہیں۔

مہران نقش

مجھے بہت خوشی ہے کہ کچھ عرصے سے اُردو زبان میں سندھ سے متعلق سیاسی سماجی، ثقافتی، ادبی اور تاریخی نوعیت کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مثلاً 'ہندوستان عربوں کی نظر میں' از معین الدین احمد ندوی؛ 'ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں' از قاضی اطہر مبارک پوری؛ 'صنادید سندھ' از مولوی محمد شفیع؛ 'تاریخ سندھ' از مولانا اعجاز الحق قدوسی؛ 'اردو سندھی کے لسانی روابط' از شرف الدین اصلاحی؛ 'سندھ میں اردو' از ڈاکٹر شاہدہ بیگم (ایک ناقص اور گمراہ کن کتاب)؛ 'آج کا سندھ' از محمود مرزا؛ 'سندھ' از مسز ممتاز راشدی؛ 'سندھ کا مقدمہ' از شکیل احمد ضیا اور 'مہران نقش' از ڈاکٹر وفا راشدی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ چودھویں صدی کے آغاز میں بھی مولانا عبدالحلیم شرر، اکبر شاہ خان نجیب آبادی، مولوی ذکاء اللہ، نیاز فتحپوری اور ابوظفر ندوی مرحومین نے تاریخ سندھ کے سلسلے میں کتابیں لکھی تھیں جن کے ماخذات قدیم اور تاریخی اعتبار سے وضاحت اور تصدیق طلب تھے۔ چنانچہ جب مجھے ڈاکٹر نظر کامرانی اور ڈاکٹر وفا راشدی نے آج علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی ادبی علمی اور ثقافتی تنظیم 'اوطاق' کے زیر اہتمام 'مہران نقش' کی تعارفی تقریب میں شرکت کی دعوت دی تو یقین جانیئے کہ میں اپنی حسب معمول (Routine) بیکار مصروفیتوں کی وجہ سے آج

کی محفل میں شرکت پر آمادہ نہ تھا لیکن ڈاکٹر وفا راشدی کی شخصیت نے مجبور کیا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ آج جیسے ہی صبح کی فضولیات کا نشہ ختم ہوا تو مجھے دفتر جانے کا گویا اذن ہوا اور دفتر میں بیٹھ کر میں نے 'مہران نقش' کے ابتدائی ساٹھ صفحے پڑھ ڈالے جن میں شروع کے چار تعارفی مضامین بھی شامل ہیں جو کہ محترم شان الحق حقی، جناب ڈاکٹر غلام علی الانہ، جناب ڈاکٹر ایاز حسین قادری نے ڈاکٹر وفا راشدی کے بارے میں اور وفا صاحب نے اپنے متعلق لکھے ہیں۔

کتابوں کی تعارفی تقریبات کا مقصد عام طور پر توصیفی اور تعریفی نوعیت کا ہوتا ہے جس کے پس منظر میں زیادہ تر دوستی کا حق ادا کرنے کی نیت ہوتی ہے۔ لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ مجھے اس کتاب کے ۵۰ صفحات پڑھنے کے بعد بہت دکھ ہوا جس کی باعث نہ صرف مزید مطالعے سے گریز کیا بلکہ یہ خیال بھی دامن گیر رہا کہ گفتار کے غلغلہ اور خامہ فرسائی کے بجائے خاموش تماشائی کی طرح آج کی محفلِ دانشورانِ سندھ شناسی میں شریک ہو جاؤں۔

؎ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ان چند کلمات کے بعد اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے دکھی ہونے کی چند وجوہات پیش کروں ورنہ میرے دوسرے دوستوں کے ناموں کا بھی دعوت نامے میں اندراج ہے جن کی گرانقدر آراء کی میں بہت قدر کرتا ہوں کیونکہ یہ حضرات تاریخ و ادب پڑھاتے ہیں!

جناب ڈاکٹر وفا راشدی نے اپنے تعارفی مضمون 'بیاں اپنا' میں انکشاف

کیا ہے کہ "مطالعہ اور تحقیق سے پتہ چلا کہ سندھی زبان کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ سرزمین سندھ کی اپنی تاریخ۔ کسی زمانے میں اس خطے کے خط مستقیم کا دوسرا سرا پنجاب تک ملتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سندھ کے قدیم شعرا کے سندھی کلام پر پنجابی اور سرائیکی زبانوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔" (صفحہ ۲۳)

مجھے یہ عبارت پڑھ کر تعجب ہوا کہ اتنے بڑے انکشاف کی تائید اور تصدیق میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا گیا۔ میں عرض کروں گا کہ اس بیان میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں۔ سرائیکی کے قادر الکلام شاعر خواجہ غلام فریدؒ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ سچل سرمست کے سرائیکی کلام سے متاثر تھے۔ باقی رہی بات پنجابی شاعری کی، تو سندھ کے قدیم شعری سرمایے میں پنجابی زبان کا کوئی عمل دخل نہیں، البتہ رشید لاشاری مرحوم نے 'ون یونٹ' کے زمانے میں اپنی مشکلات کے مداوے کے طور پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے یہ ناکام کوشش کی تھی کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی پنجابی میں شاعری کی تھی لیکن ان کے کلام کے مجموعے 'شاہ جو رسالو' کی ترتیب و تدوین کے دوران اس میں تحریف کی گئی ہے۔

اسی ضمن میں ڈاکٹر وفا راشدی صاحب نے کچھ ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جیسے کہ علاقائی ادب یا علاقائی بولیاں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں یہ سمجھ نہ سکا ہوں کہ یہ علاقائی قید و بند کیا چیز ہے جس سے بلند ہو کر سندھ کے صوفیائے کرام، علمائے دین اور ارباب فکر و دانش نے اپنے مافی الضمیر کی سرگزشت لکھی جس کو آج کمال بے رحمی

سنگدلی اور اوٹ پٹانگ سوچ کے ذریعے اچھالا جا رہا ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں مستعمل الفاظ (VOCABULARY) کے خاص معنی ہوتے ہیں چنانچہ اسلامی اخوت، قومی یکجہتی، ملکی اتحاد وغیرہ محض سیاسی پروپیگنڈہ کے پرانے بے معنی اور کھوکھلے نعرے ہیں جن کا آجکل کے حالات کے مد نظر ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا سوائے اس کے کہ کہیں لاشعوری طور پر ادبی تحریروں میں انہیں استعمال کیا جائے جس طرح وفا صاحب نے کیا۔

اس کتاب میں ایک اور پہیلی (RIDDLE) کا بھی حوالہ آتا ہے۔ 'قومی تشخص' جو چالیس برس گزرنے کے بعد بھی وضاحت طلب ہی معلوم ہوتا ہے اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد بھی یہ احساس مضبوط تر ہو کر یقین کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

قومی زبان اور ثقافت، علاقائی بولیاں اور علاقائی ثقافت کا غوغا انتشار کا باعث بنا ہوا ہے۔ ادب جو کہ عالمگیر ہوتا ہے، زبانیں جو کہ اللہ کی آیات ہیں انہیں اس طرح تقسیم اور تفریق کے بھینٹ چڑھانے کا کسی کو کیا حق پہنچتا ہے؟ پاکستان مسلمانوں کی متحدہ جدوجہد آزادی کے نتیجے میں وجود میں آیا نہ کہ تقسیم ہندوستان کی وجہ سے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کی روداد ملاحظہ کیجئے اور اس قرارداد کا مطالعہ کیجئے جو بعد میں 'قانون آزادی ہند مجریہ ۱۹۴۷' کے نام سے ہماری آزادی کی آئینی بنیاد بنی، کہیں بھی تقسیم یا بٹوارے کا نام و نشان، لفظ یا اشارہ کنایہ نہیں ملتا۔ دراصل تقسیم ہند کی غلط اصطلاح نے ہی ہمارا معاشرتی بٹوارا کیا ہوا ہے۔ اگر جغرافیائی تقسیم کا کوئی سوال ہے تو وہ پنجاب سے متعلق ہے

جس نے پنجابیوں کو یقیناً متاثر کیا لیکن مشرقی پنجاب سے نقل مکانی کرنے والے مغربی پنجاب میں ایسے آباد ہوگئے کہ آج وہاں کوئی خلفشار یا تعصب ان کی مجموعی زندگی کی تگ ودو میں نظر نہیں آتا۔

اسی طرح صفحہ ۳۴ پر دوسرے پیراگراف سے معلوم ہوتا ہے کہ وفائیؔ صاحب نے اپنے مضامین پر نظر ثانی نہیں کی اور مضامین کی طوالت کے خوف سے تفصیل دینے سے گریز کیا ہے لیکن کتاب مرتب کرتے ہوئے تو تفصیل دی جا سکتی تھی یا پھر یہ جملہ ہی حذف کیا جانا چاہیئے تھا۔ علاوہ ازیں صفحہ ۲۸، اور ۲۹ پر حاشیہ نمبر چار میں قرآن مجید کے سندھی ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے اس کو دنیا میں سب سے پہلے ترجمے کا اعزاز بھی دیا ہے جو کہ تاریخی اعتبار سے صریحاً غلط ہے۔

بزرگ بن شہریار نے اپنی تصنیف "عجائب الہند برہ وبحرہ جزائرہ" میں لکھا ہے کہ انہیں بصرہ میں ابو محمد الحسن بن عمرو بن حمویہ بن حرام بن حمویہ النجیری نے بتایا کہ وہ ۲۸۸ھ میں منصورہ میں تھا جہاں شہر کے بعض معتبر عالم اور متقی لوگوں نے انہیں بتایا کہ منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو ۲۷۰ھ میں بالائی کشمیر اور زیریں کشمیر کے درمیان واقع علاقے کے حاکم، راجا رائے نے لکھا کہ ایک ایسے عالم کو ان کے پاس بھیجا جائے جو انہیں 'ہندیہ' زبان میں 'شریعت الاسلام' سمجھائے۔ اس حاکم کا نام مہروک بن رائق تھا۔ چنانچہ امیر عبداللہ نے ایک عراقی عالم سے رجوع کیا جو منصورہ میں مدت سے مقیم تھا۔ وہ نہایت ذہین، مقامی زبانوں کا ماہر اور شاعر تھا۔ اس نے 'شریعت الاسلام' کی بنیادی تعلیمات کو منظوم کیا جو امیر عبداللہ نے راجا رائے کو بھیج دیا۔ بعد میں راجا رائے کی فرمائش

پر اس عالم کو اس کے پاس بھیج دیا گیا، جس نے تین سال کے بعد واپس آکر حاکم منصورہ کو بتایا کہ راجا رائے نے انہیں 'ہندیہ' زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر کا کام سپرد کیا تھا جو انہوں نے سورہ یٰسین تک مکمل کیا جسے سن کر راجا ایمان لے آیا اور خوش ہوکر انہیں انعام واکرام سے نوازا۔

پاکستان کے مایہ ناز محقق، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے بزرگ بن شہریار کے اس بیان کا ناقدانہ تجزیہ اپنے عالمانہ مقالے میں کیا ہے جو انہوں نے دوسری بین الاقوامی قرآن کانگریس میں پیش کیا تھا جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں دہلی میں بلائی گئی تھی۔

صفحہ نمبر ۳۲ اور ۳۳ پر پانچویں اور گیارہویں حواشی میں تطبیق ہونی چاہیئے تھی تاکہ مخدوم نوح نے جو قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور جو اب شائع بھی ہوچکا ہے اس کے متعلق مکمل معلومات یکجا ہوجاتیں۔

صفحہ ۴۰ پر سندھ میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا ذکر عجیب انداز سے کیا گیا ہے۔ خصوصاً سندھی زبان کے بارے میں متضاد باتیں لکھی گئی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اس طرح کی تحریر کو کس طرح ادبی یا تاریخی تحقیق کہا جاسکتا ہے اور کیا کتاب کے مطالعے کے بغیر ہی سندھ کے دو دانشوروں ڈاکٹر غلام علی الانا اور ڈاکٹر ایاز قادری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

"جب انگریز برسر اقتدار آئے، سندھی زبان اور اس کا ادب جادۂ ترقی پر گامزن تھا۔ انگریزوں نے ہندوؤں کی حمایت میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک

روا رکھا۔ سندھ کے عوام سے رابطہ قائم کرنے، ان کی زبان و ثقافت کو سمجھنے کے لئے سندھی زبان سیکھی، اسلامی تہذیب و معاشرت کو تباہ کرنے کی غرض سے سندھی زبان و ادب پر کاری ضرب لگائی، فارسی کو مسلمانوں کی علمی و ثقافتی زبان جان کر اس کو ختم کرنے اور اس کی جگہ سندھی زبان کو عام کرنے کے منصوبے کو فوری طور پر عملی جامہ پہنایا۔ (کیا ہندوستان میں دینی مدارس اور فارسی زبان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا؟) سندھی زبان کے مروجہ حروف کو بدل کر سندھی عربی مشترکہ حروفِ تہجی کی ترتیب و تشکیل کی۔ سندھی کے قواعد اور لغتیں خود بھی لکھیں اور مقامی اہلِ علم اور اہلِ قلم سے لکھوائیں۔ ملازمت و تجارت کے لئے سندھی سے واقفیت لازمی تھی۔ کُل ہند سطح پر اُردو کو عدالتی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جب فرنگی فرمانروائی اور جابرانہ طریقِ حکمرانی کا اولین منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو برطانوی سامراج نے سندھی کی سرپرستی ترک کر دی۔"

لیکن آگے چل کر وفا صاحب نے صفحہ ۴۲ اور ۴۳ پر انگریز سرکار کی سرپرستی میں سندھی علم و ادب کی ترقی کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ "عہدِ برطانیہ میں نثر نگاروں کی طرح شاعروں نے بھی ایک نئے ولولے اور نئی امنگ کے ساتھ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ حسنِ خیال، حسنِ بیان، لطفِ زبان، صوفیانہ و عارفانہ خیالات، رزمیہ و بزمیہ سخن آرائی سے سندھی شعر و سخن کو قابلِ رشک بنا دیا۔"

خامۂ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیئے

وفا صاحب نے سندھی ادب کا تاریخی جائزہ لکھ کر اور اسے کتاب میں شامل

کر کے اپنی علمی اور ادبی لیاقت کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ جناب پیر حسام الدین راشدی مرحوم ۱۹۵۱ء میں نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام مکمل کر چکے تھے۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے لکھا ہے کہ سندھی میں تعلیم دینا اور سندھی کو بطور ذریعۂ تعلیم استعمال کرنا، یہ دونوں مرحلے انگریزوں کے دور سے تقریباً دو صدیاں پہلے طے ہوئے۔ سندھ کے علما اور اساتذہ نے بہت پہلے ہی اپنے تجربہ سے محسوس کیا تھا کہ طلبا کی تدریس کا آغاز عربی یا فارسی سے کرنے کے بجائے اگر ان کی مادری زبان (سندھی) میں ہو اور اس کے بعد بتدریج فارسی اور عربی پڑھائی جائے تو وہ آسانی سے اور بہت جلد ان زبانوں کو پڑھ اور سمجھ سکیں گے۔ تاریخی شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں یہ سلسلہ شروع ہوا۔ بارہویں صدی ہجری کے شروع میں سندھی درسی کتابیں لکھی گئیں۔ نیز سندھی کے ذریعے فارسی پڑھنے کے لئے خاص تدریسی مواد تیار کیا گیا۔ اس سلسلے میں ضلع نواب شاہ کے تاریخی شہر دربیلہ کے عالم و استاد نظام الدین صاحب نے ۱۱۲۲ھ میں ایک اہم کتاب "انیسُ الجن" لکھی تھی۔

اسی طرح موجودہ سندھی حروف اپنی ابتدائی صورت میں عربی حروفِ تہجی کے میل سے ایک ہزار سال قبل، عرب اسلامی دور میں استعمال ہونے لگے اور بعد میں ان میں بتدریج ترمیم اور تکمیل ہوتی رہی۔ سندھ کے علما نے پہلے عربی الفابیٹ کے بعض حروف پر نکتے بڑھانے کی تدبیر سے ٹھیٹھ سندھی آوازوں کے لئے الگ حروف وضع کئے اور بعد میں فارسی الفابیٹ سے بھی چند حروف شامل کر کے سندھی الفابیٹ مکمل کی اور سندھی رسم الخط میں کتابیں

تصنیف کیں۔ انگریزوں نے فارسی کی جگہ پر سندھ میں انگریزی زبان کو ملکی زبان کا درجہ دیا اور انگریزی کے ساتھ سندھی کو بھی سرکاری مراسلت اور عدالتوں میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا (جو قیام پاکستان تک نافذ رہا)۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پہلے سے رائج شدہ سندھی الفابیٹ میں مخصوص سندھی آوازوں کے وہ حروف جو اب تک الگ الگ صورتوں میں لکھے جاتے تھے ان کی سرکاری طور پر ایک ہی تحریری صورت مقرر کی جس سے تحریر میں یکسانیت پیدا ہوئی۔ قدیم سندھی الفابیٹ میں لکھے ہوئے ایک سو چونتیس (۱۳۴) ابیات اور تین مصرعے جن میں ۱۳۸۱ الفاظ شامل ہیں، محمد رضا ٹھٹوی کی فارسی تصنیف 'بیان العارفین' میں درج ہیں جو ۱۰۳۸ ہجری کی تصنیف ہے۔ (افتتاحی خطبہ بین الاقوامی سندھی ادبی کانفرنس، سندھ یونیورسٹی، جامشورو۔ ۲ فروری ۱۹۸۰ء)

'سندھی ادب اور قومی تشخص' کا بھی یہی حال ہے۔ اس مقالہ کا عنوان ہونا چاہیئے تھا 'سندھی ادب کی اساسی اقدار' لیکن عنوانات کی صحت یا مزید جاذبیت سے قطع نظر متن میں فاش غلطیاں ہیں اور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وفا صاحب نے نہ تو اصل ماخذات کا مطالعہ کیا ہے نہ ہی ثانوی ماخذات کو پوری طرح سمجھا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۱۵ پر لکھا ہے۔

"عہد اکبری میں نظریہ پاکستان کی جس تحریک کی بنیاد حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے ہاتھوں پڑی تھی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار و معارف کی روشنی میں اس کی تجدید ہوئی۔ سید احمد شہید بریلوی کی جنگ بالاکوٹ سے اسکی تبلیغ ہوئی۔ پیر پگارا حضرت صبغت اللہ شاہ نے اپنے منظم حر مجاہدین کی

خدمات پیش کیں۔ دوسری جانب سندھ کے ایک دوسرے مجاہد رہنما سید احمد اللہ شاہ کی تحریک جہاد کی بدولت ۱۸۵۷ء میں سندھی مسلمانوں نے دریا خان جکھرانی، دل مراد کھوسو اور سید عنایت شاہ کی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھلائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ سید احمد اللہ شاہ کا سندھ سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور ڈاکٹر سید معین الحق نے اپنی انگریزی کتاب '۱۸۵۷ کا عظیم انقلاب' میں بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔

اس سلسلے میں ولی اللہی تحریک کے سندھی مجاہدین کے ذکر میں وفا صاحب نے بعض علما کے نام دیئے ہیں جو غلط ہیں۔ مثلاً مولوی محمد صادق کھڈہ والے کو کھڈہ والا، مولانا سید تاج محمود امروٹی کو مولانا تاج محمد، مولانا حماد اللہ ہالیجوی کو مولانا حماد اللہ کا پی جوئی، شیخ عبدالمجید سندھی کو مولانا عبدالمجید سندھی، مولوی عبداللہ لغاری کو مولانا عبید اللہ لغاری، شیخ عبدالرحیم (ریشمی رومال تحریک والے) کو شاہ عبدالرحیم اور ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوٹہ کو ڈاکٹر عبدالحلیم ہالیپوٹہ لکھا ہے۔ اسلامی تاریخ میں 'علم الرجال' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور ڈاکٹر وفا راشدی اس کی افادیت سے شاید بے خبر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد کے دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے علی احمد بروہی، محمد ابراہیم جویو اور شیخ عزیز کو شاعر بتلا کر ان کی شعری تخلیقات کو قومی ادب کا گرانقدر سرمایہ قرار دیا ہے۔ (ص ۵۶ - ۵۷) اور ان کی ذات و شخصیت کو سندھی شعر و ادب کی آبرو کہا ہے حالانکہ یہ تینوں نثر نویس ہیں شاعر نہیں۔ حوالہ جاتی کتابوں کے نام بھی اکثر غلط دیئے گئے ہیں۔ اس فرد گذاشت

کو کاتب کی کج نہی (Printer's mistake) نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً 'تاریخ تازہ نوائے معارک' کو 'تاریخ نوائے مبارک' لکھا ہے جس سے بڑا مغالطہ ہو سکتا ہے۔ (صفحہ ۵۷)

مجھے احساس ہے کہ اس انداز سے اتنی طویل گفتگو نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن یہ تاریخ کا معاملہ تھا اور ڈاکٹر وفا صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات کا تقاضا بھی ہے کہ میں انہیں یہ بات دوبارہ گوش گزار کروں جو ڈاکٹر ایاز قادری نے اپنے تعارفی مضمون میں لکھی ہے کہ "تحقیق کا کام گمشدہ اور پارینہ اوراق کو سامنے لانا ہے۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ اس کے لئے محنت کی بھی ضرورت ہے اور محبت کی بھی"۔ میں نے محبت سے 'مہران نقش' کے ابتدائی صفحات کا مطالعہ کیا اور محبت کے جذبے سے چند باتیں عرض کی ہیں۔ کیونکہ میں مدت سے نگاہِ قدر شناس کا طلب گار رہا ہوں جو سندھ کے بارے میں میر کے اس شعر کی ترجمانی کرے۔

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

تاہم میں سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں ؎

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں (اقبال)

(علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیم 'اوطاق' کے زیر اہتمام ڈاکٹر وفا راشدی کی کتاب 'مہران نقش' کی تعارفی تقریب (منعقدہ جمعرات ۳ مارچ ۱۹۸۸) میں پڑھا گیا۔)

جامی

سلسلۂ نقشبندیہ کے نامور عالم اور برگزیدہ صوفی مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ (۸۱۷ - ۸۹۸ھ) کا شمار نویں صدی ہجری کے فارسی کے مشہور و معروف شعرا اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام نظام الدین احمد بن محمد دشتی ہے۔ دشت اصفہان کے ایک محلے کا نام ہے۔ ان کے اجداد یہیں رہتے تھے۔ انقلاب زمانہ اور گردش روزگار کے سبب وہاں سے نقل مکانی کر کے جام (خراسان) میں آکر آباد ہو گئے۔ ایک نواحی گاؤں خرجرد میں مولانا پیدا ہوئے۔ آقای محمد تقی بہار ملک الشعرا نے اپنی کتاب 'سبک شناسی' (جلد سوم) میں لکھا ہے کہ شیخ الاسلام حضرت احمد جام (ژندہ پیل) سے عقیدت کی وجہ سے اپنا تخلص جامی قرار دیا۔

مولانا کا خاندان علم و فضل کے لئے مشہور تھا۔ والد اور دادا اپنے وقت کے معروف عالم اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ جام کے افتا اور قضا کا عہدہ بھی انہی کے سپرد تھا۔ سلسلۂ نسب ماں اور باپ دونوں کی طرف سے امام ابوحنیفہ کے مشہور و ممتاز شاگرد امام محمد تک پہنچتا ہے۔

مولانا نے ہرات اور سمرقند میں تعلیم حاصل کی جو علوم اسلامیہ اور ادبیات ایران کے مشہور مراکز تھے۔ مولانا کی ذہانت، حافظ اور دوسری خداداد صلاحیتوں نے ان کے اساتذہ کو بہت متاثر کیا۔ کسی نے کہا کہ "جامی جس کے پاس پڑھنے کیلئے گئے

خود اس کو ان سے بہت سی نئی باتیں حاصل ہوئیں" کسی نے کہا کہ "جامی کو دیکھ
کر یقین ہو گیا کہ بعض نفوسِ قدسیہ بھی اس عالم میں موجود ہیں"۔ ان کی طالب علمی
کا زمانہ بڑی بے فکری اور فارغ البالی سے گزرا۔ ان میں ابتدا ہی سے فطری طور
پر خودداری اور عزتِ نفس کا احساس زیادہ تھا۔ ان کو بچپن ہی سے بزرگانِ طریقت
فقرائے حق اور درویشانِ باصفا کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے
کے زیادہ مواقع حاصل ہوئے جس کی وجہ سے ان کے دل میں فقر و درویشی کا
شوق پیدا ہوا۔ باقاعدہ بیعت سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا سعد الدین محمد الکاشغری
سے تھی۔ مذاقِ تصوف کی تخم ریزی خواجہ محمد پارسا نے بھی کی۔ آخر میں خواجہ ناصر الدین
عبید اللہ احرار کا فیضانِ خاص عطا ہوا۔

[illegible]ھ مطابق ۱۴۷۲ء میں جامی حج کو گئے۔ پھر ہمدان، کردستان، بغداد،
کربلا معلیٰ، نجف اشرف، دمشق، حلب اور تبریز سے ہوتے ہوئے ہرات واپس
پہنچے جہاں بقیہ زندگی مطالعے، شعر و شاعری اور روحانی مجاہدات میں بسر کی۔
انہوں نے دنیاوی جاہ و منزلت کی خاطر کبھی کسی دربار کا رخ نہیں کیا۔ نہ قصائد
کہہ کر کسی کی خوشامد کی۔ اس کے باوجود ہم عصر سلاطین ان کی بے حد عزت کرتے
تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ جامی اپنی تصانیف ان کے نام معنون کریں۔ چنانچہ
انہوں نے بعض تصانیف حکمرانوں کے نام منسوب کیں۔ اس ربط و ضبط کی وجہ سے
وہ حاکمانِ وقت کے احوال کی اصلاح کی طرف متوجہ رہے۔

ظاہری و باطنی کمالات، خداداد صلاحیتوں، دنیاوی اعزاز اور قبولِ عام کے
باوجود مولانا کی طبیعت میں بلا کا انکسار اور حد درجہ اعتدال تھا۔ چونکہ سلسلۂ نقشبندیہ

کی یہ خصوصیت ہے کہ ظاہر شریعت سے تجاوز نہ کیا جائے اس لئے مولانا باوجود
مراتبِ سیر و سلوک طے کرنے کے عام محفل میں صوفیانہ اسرار زبان پر نہیں لاتے
تھے بلکہ درویشی کو چھپاتے رہتے اور لوگوں کو ہمیشہ شریعت ہی کی تعلیم و تلقین فرماتے
رہتے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے "لوائح جامی" کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہ وہ زمانہ
تھا کہ یونانی مشرکوں کے فلسفے کو مسلمانوں میں رائج ہوئے کئی سو سال ہو چکے تھے
اور اشراقیت و مشائیت، تناسخ و حلول، عقلِ کُل اور ہیولیٰ اور اسی طرح کے خاک
بلا کیسے کیسے عقاید و اوہام یونانی، مصری، ہندی، ایرانی فلسفہ نجوم اور جوگ کے
اثر سے اسلامی مدرسوں اور خانقاہوں میں داخل ہو چکے تھے اور خود مسلمانوں کے اندر
شیخ الاشراق اور طوسی و فارابی اور ابن سینا اور ابن رشد جیسے معقولی بڑی تعداد میں
پیدا ہو چکے تھے اور ان کے خرافات توحید کے خاندان میں گھر گھر پھیل چکے تھے۔ اسلامی
تصوف اب قرآن و سنت پر عمل کا نام نہ تھا۔ جنید و ذو النون کا تصوف صحابہ کرام کی
تقلید تھی۔ ان کے عقاید و اعمال ابوبکر و علی کے عقائد و اعمال تھے۔ اب دور وہ تھا
کہ ہر چیز عقلی بن چکی تھی۔ شیخ ابنِ عربی اور ان کے شاگردوں کے طفیل میں سلوک
بھی اب ایک فلسفہ تھا اور اس کے خاص خاص نظریات تھے اور بڑے بڑوں کی
خانقاہیں اور تکئے اب ایسے عقاید و اعمال کے گہوارے بن چکے تھے جن سے صحابہ
اور تابعین کے دور میں کوئی واقف نہ تھا۔ ملا جامی نے اسی فضا میں آنکھیں کھولیں
اور نشو و نما پائی۔ ابن العربی اور شیخ احمد جام وغیرہ کی طرح اگرچہ مئے وحدت کے
لذت یاب تھے لیکن ان کے کلام میں آدابِ شریعت کے خلاف ایسی کوئی بات نہیں

ملتی جس پر اربابِ شرع کو اعتراض کا موقع مل سکے۔

جامی کی تصنیف و تالیف کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن عام طور پر عدد جام کے برابر یعنی ۴۴ ہیں اور یہی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات اگرچہ نثر میں ہیں، لیکن انہیں شہرت شعری تخلیقات کے باعث ہوئی۔ انہوں نے کئی دیوان اور مثنویاں تصنیف کی ہیں۔ علومِ اسلامی کے گوناگوں شعبوں تفسیر، حدیث، سوانح، عقاید، فقہ، صوفیا کے شرح احوال و آثار، نظری عرفان، سیر و سلوک، اخلاقیات، سیاستِ مدن، داستان نویسی، معما، صرف و نحو، قافیہ، عروض، موسیقی وغیرہ کے بارے میں بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں۔ انہوں نے اسلاف کے نظریات و اقوال کی توضیح و تشریح اور استادانِ فن کے اتباع و پیروی میں محنت کی ہے۔ جامی کی نگارشات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی قوت میں کس قدر لچک تھی اور کتنے مختلف علوم تھے جن میں ان کی نظر نہایت گہری اور زبان و اسلوب پر پوری دسترس حاصل تھی۔ اگرچہ متقدمین مثلاً فردوسی، ابنِ سینا، سنائی، نظامی گنجوی، امیر خسرو، اوحدی وغیرہ بھی ان ہی یا ان سے ملتے جلتے موضوعات پر قلم اٹھا چکے تھے، بایں ہمہ جامی نے ان کی تصانیف کو اپنی مثنویوں پر اثر انداز نہیں ہونے دیا اور یہ ماننا پڑے گا کہ اپنے اسلوب کے ذریعے جو تازگی، دلربائی، لچک اور امتیازی خصوصیت کا حامل ہے، انہوں نے اس مواد میں ایک نئی جان ڈال دی۔ اعلیٰ ترین اخلاقی محاسن، جو جامی نے اپنی مثنویوں اور متعدد غزلوں میں پیش کئے ہیں، وحدت الوجودی تصوف کے بعض مباحث پر جس طرح قلم اٹھایا ہے اور جو زبان انہوں نے استعمال کی ہے، ان سب کی

بنا پر انہیں صوفی شعرا میں آخری عظیم شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ بابر نے اپنی 'تزک' میں لکھا ہے کہ "علومِ عقلی و نقلی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا" اور یہ کہ "جامی کو کسی مدح و ستائش کی ضرورت نہیں"۔[۲۰]

دنیا کے مختلف حصوں میں جامی کی کتابیں مقبول رہی ہیں اور ان کے سوانح حیات اور تصنیفات کے بارے میں دنیا کی مختلف زبانوں میں بہت سی کتابیں اور مقالات سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ ترکی کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں بھی جامی کی شخصیت اور تصانیف کی پذیرائی شروع ہی سے رہی ہے اور اب یہاں کی دینی محافل میں ان کی پُرسوز نعتوں، ادبی مجالس میں پُرشور غزلوں اور صوفیا کے حلقوں میں ان کے عرفانی نظریات اور تخلیقات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اردو اور سندھی ادب پر جامی کی فکر کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں اور ان کی بعض اہم کتابوں کے تراجم بھی کئے گئے ہیں۔

یہ فطری امر ہے کہ ایک متاثر کن کتاب یا شعر پڑھ کر قاری اس کے مصنف یا شاعر کی زندگی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا خواہاں رہتا ہے۔ جامی کے بارے میں اردو میں کوئی معیاری کتاب نہیں تھی۔ چنانچہ ایک ایرانی فاضل، علی اصغر حکمت کی فارسی کتاب 'جامی' (۱۳۲۰ھ/۱۹۴۲ء) کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے نہ صرف اس سیاسی، مذہبی اور ادبی ماحول کی تصویر سامنے آتی ہے جس میں جامی نے پرورش پائی بلکہ اس ماحول میں خود ان کے کردار کی تشخیص بھی ہو جاتی ہے۔ چک ساہن پال شریف تحصیل پھالیہ ضلع گجرات (پنجاب) کے سلسلہ قادریہ نوشاہیہ خانوادہ کے جواں سال دانشور، سید عارف نوشاہی

نے اس کتاب کے اردو ترجمہ کے ساتھ ساتھ مفید معلوماتی حواشی بھی لکھے ہیں۔ اس کتاب میں جامی کی تمام تصنیفات کے تفصیلی ذکر کے ساتھ منتخب کلام بھی دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب جامی کے آثار و تصانیف اور ان کے پیغام کو سمجھنے کے لئے اپنی جامعیت کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی کے تعاون سے، رضا پبلیکیشنز، لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔

(ماہنامہ اظہار کراچی۔ فروری ۱۹۸۴ء)

—○○○—

چھپائے نہ بنے

آج کی تقریب کا وقت ترتیبی لحاظ سے ایسا ہے جس کو نزع کے وقت سے مشابہت دی جاتی ہے۔ مجھے یہاں آتے ہوئے بھی کچھ اسی قسم کا احساس ہو رہا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مجھے مہمانِ خصوصی کے اعزاز سے نوازا بھی گیا ہے۔ یوں تو میں قد و قامت کے سبب تھوڑا سا نمایاں نظر آتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں گربہی میں آیا ہوا ہوں۔

مجھ سے پہلے آئے ہوئے مقررین کے منظر نامے سننے کے بعد یقین جانیے کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ ان اصحاب کی منظر نگاری میرے خیال میں زر نگاری سے کم نہیں۔ میں تو حلّاجیہ ہوں، البتہ کوئی راز افشاں نہیں کرونگا۔ میرا آبائی پیشہ اُلجھی ہوئی لٹ کو سلجھانا اور ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو جوڑنا ہے تاکہ پردہ پوشی ہو سکے۔ تاہم چادر اور چار دیواری کی حفاظت اور ضمانت کا فرض کسی اور کے ذمہ ہے۔

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی حیاتِ انسانی ہی کے دُکھ سُکھ کی کیفیات کے اظہار کے مختلف پیرائے ہیں۔ ضروری نہیں کہ مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ایسا طرزِ تحریر اختیار کیا جائے جس کے لئے کسی تیکنیکی گُتھی یا مغربی نگارشات کی نقالی کی جائے۔ اگر کوئی کائنات کو اُداس محسوس کرتا ہے، زندگی کو دُکھی سمجھتا

ہے تو یہ ایک انفرادی عمل ہے، ایک نفسیاتی زاویہ ہے۔ یہی صورتِ حال ضروری نہیں کہ دوسروں کے لئے بھی وہی منظر پیش کرے کیونکہ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" اور "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ" مسلمان کا عقیدہ ہے۔

دکھ محسوس کرنا اور مسرت کا اظہار کرنا انسانی فطرت ہے۔ اسی طرح صبر اور شکوہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہئیے کہ ایسے معاشرے ہی کو تبدیل کرنے کی سعی کی جائے جہاں دکھ اور غموں کا راج ہو کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے معاشرتی ماحول کو محض طنز و مزاح کے ذریعے انسان میں شگفتگی کی حس کو بیدار یا برانگیختہ کر کے یا اس میں قوتِ برداشت پیدا کر کے تبدیل تو نہیں کیا جا سکتا البتہ یاس و ناامیدی کی فضا کو مزید فروغ دیا جا سکتا ہے۔ تاہم طنز و مزاح زندگی کی سرگرمیوں میں تلاطم پیدا کرنے، تفریحِ طبع کے احساس کو اجاگر کرنے اور جذبۂ عمل کے احیا کیلئے ضروری ہے لیکن یہ ایک اکتسابی عمل ہے اس میں اصنافِ سخن جیسی بے ساختگی نہیں۔ اس کی تخلیق اور نمود کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ طنز ایک مشکل صنفِ ادب ہے جس کا مقصد ہنسی ہنسی میں کسی خامی یا کمزوری کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس میں اصلاحی پہلو نہ ہو اور اس کا معیار قائم نہ رہ سکے تو سارا مضمون تباہ ہو جاتا ہے۔ منظر صاحب کے مزاح میں ایسا نہیں ہوتا کہ ہم کھل کھلا کر ہنسیں بلکہ اکثر صرف لبوں پر مسکراہٹ کی لہریں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔

ہنسنے اور ہنسانے کا کوئی اصول مقرر نہیں ہو سکتا، تمام مزاح نگار اپنا انداز جداگانہ رکھتے ہیں۔ خوش مذاقی یا مزاحِ لطیف میں قہقہہ کم ملتا ہے۔

ان تبسم کے مواقع بہت ملتے ہیں۔ اس سے ایک طرح کا انبساط حاصل ہوتا ہے جو دیرپا بھی ہو سکتا ہے۔ منظر علی خان کو مزاح نگاروں میں ایک مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس کتاب سے پہلے چار شعری اور نثری کتابیں بھی لکھی ہیں لیکن 'چھپائے نہ بنے' میں وہ پوری طرح ظاہر ہوئے ہیں۔ کتاب کی ورق گردانی سے اس صنعتی اور سماجی انتشار SOCIAL ANARCHY کے دور میں فرحت و طمانیت کا ماحول ملتا ہے۔ ان کے یہاں سوقیانہ پن نام کو بھی نہیں ہے۔ ان کے مضامین نما انشائیے اور خاکے پڑھتے وقت ایک طرح کی دماغی ورزش ہو جاتی ہے جس کے بعد فرحت محسوس ہوتی ہے۔

منظر نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو اپنی تحریر میں کامیابی سے برتا ہے۔ اختصار کو اہمیت دی ہے اور منتخب پہلوؤں پر ہی اکتفا کیا ہے، ان کی تحریر میں تنوع ہے۔ میں نے 'چھپائے نہ بنے' میں شامل چند تحریریں پڑھیں۔ ان میں طنز ہے مگر دبا ہوا، مزاح ہے مگر شرمایا ہوا، داڑھیوں میں تنکے ہیں مگر چھپے ہوئے۔ ان کے طرزِ بیان میں روانی ہے مگر ہر دو چار قدم بعد اسپیڈ بریکر سامنے آجاتا ہے۔ ذہن کی گاڑی کئی بار اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ ان مضامین میں منظر نگاری خوب ہے البتہ کردار نگاری میں ہمدردی کا عنصر غالب ہے۔

شہر کراچی میں اب خوشی کے لمحوں کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ شکایت کتاب کے اکثر مداحوں نے کی ہے اور شاید کتاب میں موجود طنز و مزاح کی غیر مرئی لطافت اور شگفتگی کے زیر اثر یہ بات بھلا دی گئی کہ اس

شہر کو کیا ہو گیا ہے ؟ اور اب کیا کرنا چاہیئے ؟ منظر علی خان کی تحریر کی سنجیدگی کے باوجود یہ مسئلہ گمبھیر ہی رہا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے زندگی کا تصور محدود تھا۔ اسلام کی آمد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ خیالات و افکار میں انقلاب آیا۔ قرآن حکیم کے آفاقی تصور نے زندگی کے اُفق کو وسیع کر دیا۔ اس انقلاب سے ہر شعبۂ حیات متاثر ہوا۔ قرآن مجید کے زیرِ اثر علم و فن کے بہت سے نئے نئے زاویے بنے۔ شعر و ادب اور زبان پر بھی اس کے خوش گوار اثرات پڑے۔ مثلاً ادب میں حریتِ فکر، وسعتِ نظر، پاکیزگیٔ تخیل اور بلندیٔ معنی کے اوصاف پیدا ہوئے۔ اس سے پہلے عربی ادب لفظی حُسن و شوکت کے ساتھ بیشتر جذباتِ سافلہ کی ترجمانی میں لگا ہوا تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم ہی کا فیضان ہے کہ عربی ادب میں لفظی و معنوی حُسن کے ساتھ جذباتِ عالیہ کی ترجمانی کے آداب مؤثر انداز میں ظہور پذیر ہوئے۔ اثر آفرینی کے سلسلے میں حقائق پسندی، نفع بخشی اور افادی ہمہ گیری کو ملحوظ رکھنے کا درس ملا۔ صحیح ادب کا عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے اس قدیم مقولہ کی تردید کی گئی کہ "اِنَّ اَعْذَبَ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ" یعنی شعر جس قدر کذب پر مبنی ہوتا اتنا ہی شیریں ہوتا ہے قرآن مجید نے ادب و انشا کے لئے جو نام انتخاب کیا وہ 'البیان' ہے۔ سورہ الرحمان میں جہاں اس نے عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (اسے بیان سکھایا) کہا ہے تو اس سے مراد 'ادب' بھی ہے۔

اس کتابِ مبین نے ادب کا رُخ عدل و انصاف، انسانیت کی

خدمت، حق و صداقت کی تائید، نفاست پسندی، عفت و حیا اور خدا ترسی کی طرف پھیر دیا۔ اس نے ہر موضوع کو بیان کرنے کے لئے مناسب اور پُر وقار اسالیب بخشے اور غور و فکر اور دلائل و براہین سے کام لینے کی دعوت دی۔ قرآن حکیم نے بتایا کہ ادب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طیبات کو معاشرے میں مقبول کرے اور خباثت کے لئے معاشرے کی فضا ناساز گار بنائے۔ اس نے ادب کو یاس و قنوطیت کے مہلک جراثیم سے نجات دلا کر اسے جہدِ مسلسل اور حیرت آفریں رجائیت کا داعی بنایا۔ تنقید کے لئے بلند اصول دیئے اور 'احسن' کو اختیار کرنے میں کسی قسم کا تعصب نہ برتنے کی تلقین کی۔ اس سے اُس نے مدح و ہجو کے لئے نئے پیمانے مقرر کئے اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۱۳) کا بلند ترین معیار عطا کیا۔

عربی زبان پر قرآن کریم کا اثر یہ ہوا کہ اس نے عربوں کے سخت اور بے رحم دلوں میں جاگزیں ہو کر انہیں نرم کر دیا اور ان کی سطحی عقلوں میں داخل ہو کر انہیں وزنی اور ٹھوس بنا دیا۔ نتیجۃً اُن کی زبان میں حسین الفاظ، تراکیب کی خوبی، نزاکتِ اسلوب، قوتِ گویائی، زورِ بیان، نیرنگیٔ معانی، کثرتِ مضامین مطالب کی صفات کو جنم دیا۔ چنانچہ جس زبان میں بھی کسی شکل سے عربی ادب پہنچا، قرآنی خمیر کی تاثیر نے اس زبان کو بھی فکری و معنوی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج عالمی ادب میں، اور اسی طرح پاکستانی زبانوں کے ادب میں وحدتِ عالم، وحدتِ انسانیت، حریتِ فکر اور اخلاقِ فاضلہ کی جو حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، وہ اسی قرآنی ادب کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اگر آج انسانیت اپنی

آنکھوں سے تعصبات کی عینک اتارنے کی کوشش کر رہی ہے تو یہ بھی قرآنی ادب کے فیض کا ثمرہ ہے۔

اردو اب ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت میں کرّہ ارض کے طول و عرض میں وسعت پذیر ہو رہی ہے۔ کئی نئے موضوعات اور تازہ مضامین اس کی آغوش میں پرورش پاکر، وسیع اور مؤثر ذرائع ابلاغ کے وسیلے عوام الناس کی آگاہی میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ اس میں معیاری، سائنسی اور فکری ادب بھی تخلیق ہو رہا ہے۔ سیاسی، عمرانی اور اقتصادی نظریات اور حالاتِ حاضرہ کا احوال اور تجزیہ بھی ملتا ہے۔ اردو ادب میں اتنی بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے کہ اس کی کثیر الجہتی سے بعض قاری محسوس کرتے ہیں کہ اردو کا مزاج دین القیم کی دین سے مبرا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سرخ، زرد، کالا اور نیلا جو بھی رنگ مرغوب ہو، اردو ادب میں اس کا پَرتو دیکھ تو سکتے ہیں لیکن ان سب رنگوں پر سبز سایہ نمایاں نظر آتا ہے کیونکہ لغات مافی الضمیر کے اظہار میں شائستگی، صداقت اور ندرت کے ضمن میں قرآنِ حکیم کا واضح اثر نظر آتا ہے۔

منظر علی خان صاحب نہایت ذکی الحس اور ذہین اہلِ قلم ہیں۔ کبھی کبھی وہ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب سے مزاح پیدا کر کے اپنے بیان کو اس قدر خوشگوار اور پُرلطف بنالیتے ہیں کہ جیسے پڑھنے والا ان کا رازدار ہو اور وہ اس سے ہمکلام ہوں۔

منظر علی خان کے مزاج میں ٹھہراؤ رکھ رکھاؤ، ادبیت اور متانت پائی

جاتی ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے پڑھنے والے کا صاحبِ مطالعہ ہونا بھی ضروری ہے۔ بغیر اس کے وہ نہ اس کے مزاح کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے اور نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ وہ اکثر اشاروں کنایوں میں بات کہہ جاتے ہیں جو طنز نگاری کا بنیادی وصف ہے اور ان کی ذہانت کا ثبوت بھی ہے۔

ارتکازِ زر اسلام کے علاوہ دوسری مہذب سوسائٹیوں میں معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے اور بینکوں کو بھی اس زمرے میں شامل کیا نہیں جاسکتا کیونکہ یہاں روزانہ لاکھوں کروڑوں کی لین دین ہوتی ہے۔ البتہ یہ حیران کن بات ہے کہ اب بینکوں میں ارتکازِ ادب کی سرگرمیاں عام ہیں۔ آج کی تقریب میں تقسیم ہونے والے سوونیئر کو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بینک میں سب ادیب اور دانشور ہی بینکاری کا کام کرتے ہیں۔ بہرحال بینکار ادیبوں اور دانشوروں کی حوصلہ افزائی کوئی بری بات نہیں۔ اللہ کرے زورِ کرم اور زیادہ۔

(اربابِ قلم پاکستان' اور 'ہم عصر' کے زیرِ اہتمام منظر علی خان کے مجموعہ مضامین 'چھپائے نہ بنے' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا۔

۱۸۔ جولائی، ۱۹۸۸)

—OOO—

اصولِ قانون

متمدن معاشرے کی ایک نمایاں علامت قانون کی حکمرانی یعنی 'رُول آف لا' ہوتی ہے اور یہ اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب لوگوں کو قانون سے متعلق بنیادی اصولوں سے واقفیت ہو۔ قانون کا سرچشمہ جورس پرڈنس (JURISPRUDENCE) ہوتا ہے۔ جس کا ترجمہ اردو میں مولوی عبدالحق مرحوم نے 'اصولِ قانون' کیا ہے۔ اصولِ قانون اُس فلسفے کا نام ہے جس میں قانون کی ماہیت کے بارے میں محض نظریاتی اور خالص علمی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کے ذریعے کسی ایک ملک کے قانون کے متعلق واقفیت حاصل نہیں کی جاتی بلکہ خود قانون کے بارے میں جو ذہن میں عام خیال آتا ہے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ قانون کی ماہیت کیا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مُغلوں کے عہدِ اقتدار تک قانونِ شرع نافذ تھا انگریز سامراج کے ابتدائی دور میں بھی اسی قانون کو جاری رکھا گیا لیکن ملک پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ عربی اور فارسی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان نافذ کی جائے۔ اسی طرح عدالتوں میں اسلامی شرع کے بجائے رومن لا (ROMAN LAW) کی مروج شکل میں جورس پروڈنس (JURISPRUDENCE) کو رائج کیا گیا جو کہ انگریزوں کا اپنا

قومی قانون تھا۔

قانون کے تحت قائم ہونے والی ایک ریاست کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ایک مجموعہ قوانین موجود ہو جن کی روح سے یہ نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے رفاہ عامہ کی خدمات فراہم کرنے کے لئے اور دیگر بہت سے امور کی انجام دہی کے لئے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو بروئے کار لائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قوانین 'اصولِ قانون' سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک قانون مواد کے لحاظ سے دوسرے قانون سے مختلف ہوتا ہے تاہم قانون کی ساخت اور ترتیب میں مجموعی طور پر جس چیز کو بنیادی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے اسے اصولِ قانون کی کتابوں میں درج کر دیا جاتا ہے۔

اگر قانون کا مطالعہ کرنے والوں کو قانونی نظام سے بامعنی طور پر متعارف کرانا ہے تو یہ ضروری ہے کہ انہیں اصولِ قانون کا علم فراہم کیا جائے کیونکہ انہیں ان تمام قوانین کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی جن کے مطابق عصرِ حاضر کی حکومتیں اپنے کام چلاتی ہیں۔ اس ضمن میں عام طور پر سالمنڈ اور ہیٹن کی کتابیں، قانون کے طلباء کو پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ آزادی کے بعد قومی یا کسی دوسری پاکستانی زبان میں قانون کی کتابیں مہیا کرنے کے سلسلے میں صحیح طور پر توجہ نہیں دی گئی۔ جناب عزیز احمد ایڈوکیٹ نے ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ میں برسوں کے پیشہ ورانہ تجربے اور اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر جورس پروڈنس جیسے

ایک انتہائی نازک اور پیچیدہ موضوع پر اردو میں کتاب تصنیف کی اور اس کا نام 'اصولِ قانون' رکھا۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ فلسفۂ قانون کے بنیادی مطالعہ کو عزیز احمد صاحب نے سلیس اردو میں پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان لطیف ہے اور کتاب کو پڑھنے سے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ خاص طور سے اس صورت میں جبکہ ہم ایک اجنبی نظام کی تصوراتی خصوصیت سے پیدا ہونے والی مشکلات اور پیچیدگیوں کو ذہن میں رکھیں۔ اس موضوع کی انتہائی پیچ در پیچ اصطلاحات، لطیف فقروں اور نازک نظریات کے مناسب متبادل فراہم کرنے کے سلسلے میں عزیز احمد صاحب کی اس کتاب کو میں اردو زبان میں قانون کی کتابوں میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قانون کے طالب علم کے لئے زمانۂ حال کے قانون کے بنیادی تصور کے تجزیہ کو اسلامی اصولِ قانون کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے قانون کے ان ابتدائی اصولوں اور بنیادی اصطلاحات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، جو مغربی اصولِ قانون کے مطابق ہیں متوازی تصورات کا بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو اسلامی اصولِ قانون سے تعلق رکھتے ہیں اور اس ضمن میں فاضل مصنف نے قرآن حکیم کے علاوہ اسلامی اصولِ قانون کی معیاری کتابوں کے حوالے بھی فراہم کئے

ہیں جس سے ماہرین نے، قانون کی سائنس کی جو حقیقی تصویر پیش کی ہے وہ نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے اور یوں مغربی اصولِ قانون اور اسلامی اصولِ قانون دونوں کے نقطہ ہائے نظر سے یہ کتاب مکمل ہوجاتی ہے۔

ہم مسلمان جب یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں انسان ذات کی رہنمائی کے لئے مکمل ہدایات موجود ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں کوئی مربوط و متشکل ڈھانچہ پیش نہیں کیا گیا ہے البتہ واضح اور جامع اصول دیئے گئے ہیں۔ اصولِ قانون کے حوالے سے جناب عزیز احمد نے ایسے تمام احکامات کو اپنی تصنیف کے مختلف ابواب میں نہایت احسن طریقے سے مدوّن کیا ہے۔

پاکستان میں اس وقت قوانین کو اسلامی ڈھانچہ میں لانے کی جو قومی جدوجہد شروع کی گئی ہے اس کے پس منظر میں عزیز احمد صاحب کی کتاب 'اصولِ قانون' ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے۔ ہمارے لا کالجوں میں، خاص طور سے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہو اور یونیورسٹی میں قانون کے طالبِ علم کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے اور اس کو لازمی قرار دیا جانا چاہیئے۔ عزیز احمد صاحب کی یہ مختصر مگر جامع تصنیف ۱۶ سولہ ابواب پر مشتمل ہے جو درسی اور حوالے کی کتاب کے علاوہ اصولِ قانون سے متعلق دلچسپ معلومات کا ذخیرہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ موضوع پر ان کی دسترس اور وسیع مطالعے کی غمازی کرتی ہے۔ اسی طرح یہ کتاب ایک عام قاری کے لئے بھی اتنی ہی دلچسپ اور سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔ مجھے بیحد خوشی ہے کہ ہماری قومی زبان میں اصولِ قانون جیسے دقیق موضوع پر ایسی دلچسپ اور اہم کتاب شائع ہوئی ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

حقیقتِ علمی شاعری

مثنوی نظم کی ایک قسم ہے جس میں حسبِ قاعدہ ہر بیت ہر لحاظ سے بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ فارسی، ترکی، اردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں ہر قسم کی طویل منظومات رزمیہ، عشقیہ، اخلاقیہ یا ناصحانہ موضوعات پر مثنوی میں لکھی گئی ہیں۔ یہ صنف غالباً سب سے پہلے ایران میں ایجاد ہوئی اور زیادہ تر فارسی مثنویاں ہی مشہور و معروف ہیں اور دوسری زبانوں کی بعض مثنویوں کے ماخذ بھی۔

اس قسم کی سب سے پہلی مکمل نظم جو محفوظ رہ گئی ہے 'شاہنامہ' ہے جسے فردوسی نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس ضمن میں عنصری، سنائیؔ، خاقانیؔ، ناصر خسروؔ، عرفیؔ، فخرالدین گرگانی، نظامی گنجوی، عبدالرحمٰن جامیؔ، فریدالدین عطارؔ، جلال الدین رومیؔ، محمود شبستری، سعدیؔ، امیر خسروؔ، عبدالقادر بیدلؔ، غالبؔ اور علامہ اقبالؔ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں مثنوی کا ذکر ہوتا ہے تو ہمارا خیال مثنوی مولانا رومیؔ کی طرف ہی مبذول ہوتا ہے۔

عربی زبان میں فارسی مثنوی کی طرح باقاعدہ صنف موجود نہیں لیکن ایسی نظمیں ضرور موجود ہیں جن کے ہر بیت کے مصرعے آپس میں

ہم قافیہ ہیں اور دوسرے ابیات سے قافیے میں مختلف ہیں۔

جنوبی ایشیا میں فارسی ادب کے فروغ میں سندھ کا قابلِ قدر حصہ رہا ہے۔ چنانچہ مثنوی کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ عطا ٹھٹوی (م-۱۷۲۷) نے چھوٹی چھوٹی آٹھ مثنویاں لکھیں۔ عظیم ٹھٹوی (م-۱۷۹۹) ضیا ٹھٹوی (م-۱۸۰۰)، ولی محمد لغاری (م-۱۸۳۲) اور فقیر قادر بخش بیدلؔ (م-۱۸۷۲) نے ہیر رانجھا کی مشہور داستان کو مثنوی میں رقم کیا۔ فقیر عبدالوہاب سچل سائیں (م-۱۸۲۷) نے سات مثنویاں لکھیں جو تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹی (م-۱۹۲۹) کی سندھی زبان میں مثنوی 'یوسف زلیخا' اور حافظ عبداللہ بتسل کی سندھی میں مثنوی 'محمدی' بھی کافی شہرت رکھتی ہیں۔

اردو شاعری میں مثنوی کا آغاز فارسی مثنوی کی تقلید میں ہوا جس کی ابتدا محمد قلی قطب شاہ کے دور میں ہوئی۔ اردو مثنوی کے اہم موضوعات تاریخ یا عشقیہ کہانیاں ہیں۔ مثنوی میں ترجموں کی تعداد خاصی کم ہے مگر مذہبی، اخلاقی اور صوفیانہ مثنویاں کچھ کم تعداد میں ہیں یا یہ کہ ان کا سراغ نہیں ملتا۔

گجرات اور دکن کے مقابلے میں شمالی ہندوستان میں مثنوی کی نسبت غزل کو زیادہ ترقی ہوئی۔ چنانچہ دلی اور لکھنؤ میں اگرچہ اچھی اچھی مثنویاں لکھی گئیں مگر یہاں مثنویوں کی تعداد کم ہے۔ اس کے علاوہ دکن کی مثنویوں میں خارجی جزئیات اور مقامی اور وطنی اشیا اور معلومات سے

دلچسپی زیادہ نظر آتی ہے۔ بہرحال شمالی ہند کے شعرا میں خواجہ میر درد، میر تقی میر، سودا، میر حسن دہلوی، جرأت، دیا شنکر نسیم، نواب مرزا شوق، مومن خان مومن، حضرت داغ، امیر مینائی کی مثنویاں مشہور ہیں۔ دورِ جدید میں محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، اسماعیل میرٹھی، اکبر، اقبال، سیماب اکبر آبادی، جوش ملیح آبادی اور بعض دوسرے شعرا نے کافی تعداد میں نظمیں لکھیں جن کے موضوعات اخلاقی، تاریخی، سیاسی اور منظریہ ہیں مگر ان کو مثنویوں کے بجائے طویل نظموں میں شمار کرنا مناسب ہوگا۔ البتہ حفیظ جالندھری کا 'شاہنامہ اسلام' بجا طور سے آخری دور کی بیانیہ تاریخی مثنویوں میں امتیازی مقام کا مستحق ہے۔

حقائق کے اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکنی دور کی مثنویوں میں خارجی جذبات نگاری کا خاص میلان پایا جاتا ہے۔ شمالی ہند (دلی) کی مثنویات شدتِ جذبات کی آئینہ دار ہیں اور درد و الم کی کیفیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ دلی کے مہاجر شعرا نے لکھنؤ پہنچکر جو مثنویاں لکھیں ان میں بھی جذبے کی گہرائی ہے مگر ان میں الم کی نوک تیز نہیں۔ لکھنؤ کی مثنویاں محبت کے خارجی کوائف کی مصوری اور اسلوب بیان کے لئے امتیاز رکھتی ہیں۔ بعد کی مثنویاں وقتی اور متفرق موضوعات سے متعلق ہیں، اور اس تفصیل نگاری سے محروم ہیں جو فرصت کی طلبگار ہے اور مثنوی کی مقتضیات میں شامل ہے۔ (سید عبداللہ)

ہمارے ایک نامور بزرگ ادیب اور نقاد نے مثنوی 'زہرِ عشق'

کے حوالے سے ایک جگہ فنونِ لطیفہ کی اہمیت، اس کی ضرورت اور فنکاروں کی ذمہ داریاں اس طرح بیان کی ہیں۔

" انسان جب اخلاقیات، معاشیات، مذہبیات، سیاسیات اور تمام دنیا بھر کے خرافات سے عاجز ہو جاتا ہے تب وہ فنونِ لطیفہ سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ فلسفۂ جدید کے مُسلّمات میں سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کو دراصل اخلاقیات، مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ شاعری کو فنونِ لطیفہ کے سرِ فہرست رکھا گیا ہے۔ اس کا تعلق انسان کے وارداتِ قلب سے ہے۔ شعر نام ہے کسی جذبہ کے اظہار کا۔ شاعر کو اس سے بحث نہیں کہ ایسا ہونا چاہیئے یا نہیں، وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ دنیائے بشریت میں بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اس اقتباس میں مجنونیت اور علمی کم مائیگی نمایاں ہے۔ سب سے پہلے اس اقتباس کے لہجے پر جب ہم غور کرتے ہیں تو نقاد کے متعلق یہ احساس شدت کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر جب وہ علوم کا رشتہ فنون سے فلسفۂ جدید کے 'مسلمات' کی مدد سے ہمیں سمجھاتے ہیں تو ان کی معلومات کے معیار پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کا اندازِ کلام کچھ ایسا ہے کہ جیسے سیاست، مذہب اور اخلاق ایک دوسرے کی ضد ہیں اور فنون کے مقابلے میں تمام علوم تہذیب و تمدن کی سوتیلی اولاد، جسے انتہائی مجبوری میں آدمی جھیل رہا ہے، ورنہ وہ اس لائق

نہیں کہ فنِ لطیف کے ہوتے ہوئے انہیں قریب بھی پھٹکنے دیا جائے ۔

فنونِ لطیفہ کی تاریخ و ترویج اور اخلاق و مذہب کے مفہوم کے بارے میں تفصیل سے کچھ کہنا بے محل ہے ۔ البتہ میں اتنا ضرور کہنے کی جسارت کروں گا کہ خرافات اور مذہبیات کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا نہیں چاہیئے ۔ جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے اگر اس کے لازوال نمونے یکجا کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ تمام اعلیٰ نمونے مذہب ہی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ کیا ایلورا اور اجنتا کے غار اور کیا یونان و مصر و روما ، وادی سندھ اور گندھارا کے بچے کھچے کھنڈرات ۔ مذہب ہی مصوری کو رنگ و روغن بخشتا رہا ہے ۔ موسیقی اور سنگ تراشی کے لافانی نمونے مذہب سے ہی تعلق رکھتے ہیں ۔ ہماری شاعری میں جذبات کا بڑا دخل ہے لیکن اظہارِ جذبات نہیں بلکہ اندازِ بیان جذباتی ہوتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں میں کچھ فرق ہے ۔

اس لئے ان بزرگ نقاد کا کہنا کہ "انسان جب اخلاقیات ، معاشیات ، مذہبیات ، سیاسیات اور تمام دنیا بھر کے خرافات سے عاجز ہو جاتا ہے ، تب وہ فنونِ لطیفہ سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے " ایسا بیان یا دعویٰ معلوم ہوتا ہے جو فنونِ لطیفہ کی تاریخ و ترویج سے قطعی ناواقفیت پر مبنی ہو ۔ فنونِ لطیفہ کو محض لطف و تفریح کی غرض سے لطیف نہیں کہا گیا بلکہ ان کا ڈھنگ لطیف ہوتا ہے ۔ فنِ لطیف کا اولین فرض کثافت میں لطافت کی تلاش و جستجو ہے ۔ تمام فنونِ لطیفہ کی یہی حقیقت ہے ۔

شاید اسی لئے تمام عظیم فنکاروں نے اپنے عقائد کو فنونِ لطیفہ میں سمو دیا ہے کہ لطافت کا اظہار لطیف ذریعہ سے ہی ممکن تھا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ فنونِ لطیفہ نے عقائد کو لطیف بنا دیا کہ موضوع نے بعض فنون کو لطیف تر کر دیا ۔

علوم و فنون میں کہیں کہیں لطافت و کثافت میں پیکار جو ہمیں نظر آتی ہے وہ اس لئے نہیں کہ آدمی کثافت سے گھبرا کر لطافت کی طرف بھاگتا ہے ، یا ایک سے بیزار ہو کر دوسرے میں پناہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ کسی علم کی ترقی ہو پاتی اور نہ فنون میں شگفتگی باقی رہتی ۔ یہ آدمی کی فطرت میں تخلیق کی تشنگی ناتمام کا کرشمہ ہے جو اسے قدم قدم پر نئے نئے تجربوں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے اور یہ اس کی رُوح میں ایک نامعلوم حقیقت کی تلاشِ پیہم کی تڑپ اور کسک ہے جو اُسے کبھی جلالِ شوکتِ سنجر و سلیم میں ملبوس کر دیتی ہے اور کبھی جمالِ فقرِ جنید و بایزید میں مستور ۔ کبھی اس کی روح میں خارجی میلانات استوار ہوئے تو اہرامِ مصر کی ہیبت بن گیا ہے اور کبھی تاج محل کا تغزل اور جب داخلی اضطراب نے بے چین کر دیا تو کوئی راگ بن کر پھوٹا یا سرمد و حلاج بن کر تڑپا ۔ غرض کہ آدمی کی آدمیت نہ محض لطافت ہے نہ صرف کثافت ۔ آدمی نام ہے اس عظیم کارنامے کا جس کو تہذیب و تمدن کہا جاتا ہے ، جو مجموعی نتیجہ ہے تنظیمِ پیہم اور تخریبِ مسلسل کا ۔ آدمی بے زاری کا پتلہ ہے اور نہ حیا کا مجسمہ ۔ یہ اپنی دنیا کا مرکزی کردار خود ہے جس پر اُنگلی اٹھانے والا

آدمی خود آدمی نہیں پیدا کر سکا۔

رہی بات فلسفے کی تو وہ مجذوب کی بڑ نہیں۔ ایک منظم فکر ہے جس میں غیر معمولی بے کلی اور اضطراب اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کی حقیقت متعین کرنے میں وہ دوسرے علوم و فنون سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ فیصلہ کرے کہ "فنونِ لطیفہ کو دراصل اخلاقیات و مذہب سے کوئی علاقہ نہیں"۔ مذہب سے اگر کسی کو کوئی کد ہے تو اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ مذہب کو عقائد کا گورکھ دھندا سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ تمام علوم و فنون کے مجموعی شعور کا دوسرا نام مذہب ہے۔ تہذیب و تمدن کے راستہ ہی کو مذہب کہا جاتا ہے جس پر اخلاقیات و سیاسیات اور معاش و معیشت کے شاداب و بارآور درخت سایہ فگن ہیں کہ ان کی خوراک اسی سے حاصل ہوتی رہی ہے۔ مذہب پر چلنے والے مہذب ہوئے جن سے تہذیب بنی جو علم و حکمت اور صنعت و فنون کے ذریعہ تمناؤں اور ولولوں کی عکاسی کرتی رہی ہے۔ (محمد حسن "مثنوی زہرِ عشق اور اس کے نقاد"۔ کراچی ۱۹۶۲، صفحہ ۳۸-۴۳)

میں مثنوی کے فن اور فروغ کے متعلق بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آج کل نہ صرف اس کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی ہے بلکہ شعرا نے بھی اس قدیم صنف سخن کی طرف بے اعتنائی برتی ہے۔ ان حالات میں جب بھائی رشید منظر نے اپنے دادا نصیر الدین نصیر عظیم آبادی کی کتاب "حقیقتِ شاعری" کے اعزازی نسخے سے مجھے نوازا تو مجھے بہت خوشی

ہوئی۔ یہ مثنوی آج سے ۵۸ برس پہلے مسلمانوں کے عظیم اشاعتی ادارے مکتبہ معارف، اعظم گڑھ (بھارت) نے شائع کی تھی اور اب اردو اکیڈمی اور مکتبہ لیل و نہار، لندن نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس اقدام کے لئے ایک طرف اردو اکیڈمی، لندن کے اصحاب قابلِ ستائش ہیں اور دوسری طرف اردو زبان کی وسعت اور مقبولیت کا یہ بیّن ثبوت ہے کہ اب اس کی بین الاقوامیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ الحمد للہ یہ ہماری قومی زبان ہے اور اس کے فروغ سے ہماری شناخت کو بھی چار چاند لگ جائیں گے اور ہم اپنے نظریات اور مطالبات کی نشر و اشاعت کا فرض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گے۔

مثنوی "حقیقتِ شاعری" میں کوئی قدیم یا جدید قصہ کہانی نہیں۔ یہ شاعری کے موضوع کا تاریخی مذکور ہے جس میں نفسِ مضمون کے علاوہ مختلف ادوار اور زبانوں کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب میں انگریزی کے بعض شعرا کے کلام کا بھی منظوم تجزیہ کیا ہوا ہے۔ گویا اس مثنوی میں شاعری کے فن اور تاریخ کو ایسے مربوط اور دلچسپ انداز میں منظوم کیا گیا ہے کہ یہ ایک مبتدی شاعر اور محقق دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید اور مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

میں تفصیل میں جانے کی بجائے محض ذیلی عنوانات کو دہراتا ہوں مثلاً حقیقی شاعری، مجازی شاعری، جذبات، احوالِ عالم سے کیوں کر بنتے ہیں۔ شاعری شاعر کے لئے حیات جاودانی ہے، شاعری وہبی ہے، شاعری کیسی ہو، شاعری کی قدامت و فضیلت، مقدس شاعری، نظم عبرانی، سنسکرت کی

شاعری، نظمِ یونانی، نظمِ لاطینی، ایامِ جاہلیت کی عربی شاعری، فتح فارس کے بعد کی عربی شاعری، فارسی کی شاعری، بھاشا کی شاعری، شاعری علم ہے اور علوم خاص، اقسامِ شاعری، بزم کی غایت، رزم کی غایت، ہجو کی غایت، مرثیے کی غایت، ناٹک کی غایت، وزن، قافیہ، نظم کے متعلق چند ہدایتیں نظم پر بے سمجھی کے اعتراضات، فنونِ شریفہ، بت تراشی، مصوری، معماری، موسیقی، نظم و نثر کا مقابلہ، احوالِ مصنف، اردو کی مختصر تاریخ، دورِ اوّل، دورِ دوم، دورِ سوم، دورِ چہارم، دورِ پنجم (ان ادوار میں نصیر صاحب نے آبرو، ناجی، مضمون، حاتم، آرزو، فغاں، جانِ جاناں، میر، سودا، راسخ، درد، سوز، جرأت، میر حسن، انشا، مصحفی، اسیر، ناسخ، رشک، بحر، وزیر، خلیق، ضمیر، آتش، دیا شنکر، نواب مرزا شوق، رند، صبا، ازل، نصیر، مومن، ذوق، ظفر، غالب، دبیر، انیس، داغ، اور امیر کے فن و فکر کا ذکر کیا ہے) اس کے بعد نظمِ فرنگ کے بیان میں چوسر، اسپنسر، ملٹن، شیکسپیئر، ڈرائیڈن، پوپ، گولڈ اسمتھ، کوپر، ورڈس ورتھ، کولرج، شیلی، بائرن، ٹینیسن، براؤننگ اور آرنلڈ کے کلام کا تجزیہ کیا ہے۔

بعد ازاں 'ملک اور آب و ہوا کا اثر شاعری پر'، 'مقابلہ و موازنہ نظم مشرق و مغرب' کے عنوانات کے ذیل میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ؎

قسم ہے صرف عاشقی کی دو
یا حقیقی ہو یا مجازی ہو
عشق دیکھا خدا کی الفت میں
حسن جس کا ہے اچھی صورت میں

عشق دونوں طرح کے ہیں کامل
جس سے روشن ہے مومنوں کا دل (صفحہ ۱۴۹)

میں دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں نے شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کے 'مقدمۂ شعر و شاعری' کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح میں نے استادِ محترم پروفیسر ممتاز حسین کی تازہ عالمانہ تصنیف بعنوان 'حالی کے شعری نظریات، ایک تنقیدی مطالعہ' بھی پوری طرح نہیں پڑھی تاہم نصیر الدین نصیر مرحوم کی مثنوی 'حقیقتِ شاعری' جو ایک طرح منظوم تذکرۂ شعرائے اردو بھی ہے مجھے بہت بھائی۔

اس کتاب میں میرے لئے دلچسپی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ مثنوی ایک نہایت ہی روشن خیال عالم اور مصلح بزرگ نے لکھی ہے اور عالمِ اسلام کے ایک جید عالم سید سلیمان ندویؒ نے نہ صرف اس کو پسند کیا بلکہ اس پر ایک عالمانہ دیباچہ بھی لکھا۔ اس وجہ سے میں اس کتاب کو اپنے لئے نہایت ہی متبرک تحفہ تصور کرتا ہوں۔

آج کل پاکستان میں بہت سی قدیم کتابیں دوبارہ چھاپی جارہی ہیں میری گزارش ہے کہ ادبیاتِ پاکستان یا مقتدرہ اردو یا اسی قسم کا کوئی ذمہ دار اور فعال ادارہ ایک جامع پروگرام کے تحت یہ کام سرانجام دے تاکہ ہماری نئی نسل کی رہنمائی ہو سکے، اردو کا دامن مالامال ہو اور مصنفین اور ناشرین اشاعتی اداروں کے حقوق کا تحفظ بھی ہو سکے۔

(مثنوی 'حقیقتِ شاعری' کی تقریبِ رونمائی منعقدہ ۱۰ اگست ۱۹۸۸ میں پڑھا گیا)

نئی نظم اور پورا آدمی

'نئی نظم اور پورا آدمی' اردو کے مشہور ادیب سلیم احمد کی تالیف کا نام ہے جو موصوف کے چار مقالات (۱) نئی نظم اور پورا آدمی (۲) غزل مظفر اور ہندوستان' (۳) غالب اور نیا آدمی (۴) عشق اور قحطِ دمشق پر مشتمل ہے۔ یہ تالیف مجلد ہے اور ڈیمی سائز کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت درمیانے درجے کی ہے جو ان مقالات کے شایانِ شان نہیں۔ اس کتاب کی قیمت تین روپے پچاس پیسے ہے اور اسے ادبی اکیڈمی کراچی نے شائع کیا ہے۔

اردو ادب میں نقادوں اور تنقید نگاروں کی تعداد گنی چنی ہے۔ صفِ اوّل کے نقادوں میں نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ان نقادوں کی تحریریں اکثر و بیشتر پڑھنے میں آتی رہتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض اردو ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سلیم احمد نے اپنے ان چار مقالات میں اردو ادب کی مختلف صنفوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنے مقالات میں غزل اور افسانہ کو زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو ادب میں سے غزل اور افسانہ کو نکال دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

انہوں نے غالب سے لے کر منٹو اور میراجی تک اردو ادب کا نظریاتی تجزیہ کیا ہے جو کافی حد تک درست ہے۔ ان کے مقالات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً ان تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن کے اظہار کی جرأت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

سلیم احمد نے غالب، حالی، اقبال، اختر شیرانی، فیض، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، ن م راشد، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور دیگر دانشوروں کے ایسے نظریات کو پیش کیا ہے جو متعلقہ ادیب یا شاعر کی زندگی کے صحیح عکاس ہوں۔

سلیم احمد کے خیال کے مطابق کوئی شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات میں اپنے ہی تجربات پیش کرتا ہے۔ وہ یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ادب کو زندگی سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں زندگی کے واقعات کی جھلک نہیں، وہ کبھی 'پورا آدمی' نہیں ہو سکتا۔

ان مضامین کے ذریعے مختصر لیکن جامع انداز میں انہوں نے کسری اور پورے آدمی کا تصور پیش کیا ہے، یعنی آدمی جبلت کے لئے اور انسان قانون کی علامت کے طور پر زیرِ بحث آیا ہے۔ انسان کی اس بحث میں سلیم صاحب نے اپنی نکتہ آرائی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ لیکن وہ جبلت (حیوانی سطح) اور قانون (معاشرتی سطح) کی درمیانی کڑی یعنی فطرت کو نظر انداز کر گئے ہیں جو درحقیقت جبلت اور انسانی شعور کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف کا جائزہ لینے کے بعد سلیم احمد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ۱۸۵۷ کے بعد برٹش انڈیا میں نئے تہذیبی رجحانات کی اثر پذیری کی وجہ سے آدمی انسان تو کیا بنتا، وہ دو واضح حصوں

میں بٹ گیا اس ضمن میں اختر شیرانی اور ان جیسے رومانی شعرا کے کلام کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انہوں نے عورت کے حوالے سے جس آدمی سے بحث کی ہے وہ 'ادھورا آدمی' ہے یعنی اس کا اپر سیلف (Upper Self) تو ہے لیکن لوئر سیلف (Lower Self) نہیں ہے۔ اس کے برعکس میراجی اور اس مکتبۂ فکر سے منسلک دوسرے شاعروں نے عورت کے حوالے سے آدمی کے جس تصور کو پیش کیا ہے وہ بھی ادھورا ہے یعنی اس میں صرف لوئر سیلف ہے اپر سیلف غائب ہے سلیم احمد کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف ہائر سیلف کو اہمیت نہیں دیتے، ان کا کہنا ہے کہ لوئر سیلف کے بغیر انسان کی کلیت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے۔

مثالی انسان یا انسانِ کامل کا تصور اور اس کی تلاش کا قصہ پرانا ہے اور اس سلسلے میں قدیم اور جدید دور کے بہت سے مفکروں کے نظریات ملتے ہیں جو مابعد الطبیعاتی نوعیت کے ہیں۔ قدما نے اس تصور کی تکمیلی صورت کو پیغمبروں کی ذات میں پایا۔ جدید عہد میں بھی اس جستجو کی مثالیں ملتی ہیں۔

مارکس نے جس آدمی کا تصور پیش کیا وہ معاشی آدمی ہے جو روٹی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا یعنی بھوک اسے جذبۂ عشق سے عاری بنا دیتی ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا (فیض)

کارلائل کے ہاں آدمی کا صرف دماغ ہے اور روسو پاکیزہ جذبات کی تبلیغ کرتا ہے یعنی محبوب کا جسمانی حسن جسمانی خواہش سے مبرا ہونا چاہئے

کیونکہ حسن محبوب میں نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ نرد کو چاہئے کہ وہ حُسن کی اداؤں کو اپنے ہی ذوق کا کرشمہ سمجھے یعنی استلذاذ بالنفس۔

اسی طرح فرائیڈ کا آدمی بھی نامکمل ہے کیونکہ وہ حیات کی ہر ایک سرگرمی کو جنس کے طابع قرار دیتا ہے۔

رینے گینوں اور عسکری کے ہاں آدمی کے 'ہائر سیلف' کی تلاش ملتی ہے۔

سلیم احمد نے عہد جدید کی کسریت کو زمانہ قدیم کی کلیت کو سامنے رکھ کر دیکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ (غدر) سے قبل آدمی میں کلیت یا وحدت تھی جو بعد میں بکھر گئی اور پورا آدمی ٹوٹ پھوٹ کر سیاسی، اخلاقی، اصلاحی، رومانی آدمی کی شکل میں زندہ رہا تھا۔

حسرت نے جس نوجوان نسل کو دریافت کیا تھا اس کے سامنے سیاست کے جتنے بڑے آدرش تھے اتنی ہی تندرست اور توانا اس کی جنسی زندگی بھی تھی لیکن نئے ادیبوں نے ۱۹۳۶ میں جس نئے ہندوستان کو ڈھونڈا تھا اس کے سیاسی آدرش جتنے توانا تھے اس کی جنسی زندگی اس کے برعکس اتنی ہی گھناؤنی اور مریضانہ تھی۔ آخر اس تضاد کی کیا وجہ ہے؟

سلیم صاحب نے ان سوالوں کے جواب میں 'نئی نظم اور پورا آدمی' مضمون لکھا جو ۱۹۶۱ میں 'نیا دور' (کراچی) میں شائع ہوا جس میں وہ سیاسی، سماجی روحانی، تاریخی، نفسیاتی، رومانی، جنسی اور اسی طرح کے دوسرے عنوانوں پر بحث کرتے ہوئے ایک ایسے اندیشے سے دوچار ہو جاتے ہیں جو فرائڈ کے نظریات کو شعوری طور پر صحیح تسلیم کرنے کی وجہ سے اس کے فکر پر حاوی ہے یعنی آدمی کے نیچے اور اوپر

کے دھڑ میں اس کی اکائی کے تقسیم ہونے کا نظریہ۔ چنانچہ سلیم احمد کا خیال ہے کہ نظم میں انسان کی اکائی تقسیم ہو رہی ہے اس لئے وہ پورے آدمی کی بات کرتے ہیں۔ باقی تین مضامین اسی ایک مضمون کا تتمہ ہیں۔

سلیم احمد کے تصور کسریت کو تین زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ انہوں نے ساری بحث جنسی یا حیاتیاتی سطح پر کی ہے اور اس سے اُوپر اُٹھ کر نہیں دیکھا۔ ان کے مجموعہ کلام 'بیاض' کے مطالعہ سے اس نقطۂ نظر کو تقویت ملتی ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ انہوں نے مابعد الطبیعاتی سطح پر کلیت کی تلاش کی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ 'پورا آدمی' حقیقتِ مطلق سے وابستہ ہوئے بغیر نہیں بنتا۔ تیسرا زاویہ یہ ہے کہ سلیم احمد کی فکر ابھی تشکیلی نوعیت کی ہے۔ ان کا کسریت کا تصور حیاتیاتی یا مابعد الطبیعاتی، تہذیبی یا روحانی سطح تک محدود نہیں۔ وہ موقع و محل کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے کسی بھی نظریے کو ان کی تحریروں کے اندر رہ کر تلاش کرنا اور سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ انہوں نے میراجی، منٹو اور ن۔م۔ راشد کو پورا آدمی کہا ہے۔

ان مضامین میں عموماً اور 'غزل، مقلر اور ہندوستان' میں خصوصاً مولانا الطاف حسین حالی پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ اس مخالفت یا مخاصمت کی وجہ یہ ہے کہ سلیم احمد کو مولانا حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کی مندرجات سے شدید اختلاف ہے۔ لکھتے ہیں کہ حالی نے صرف غزل ہی کو بُرا بھلا نہیں کہا بلکہ شاعری کی جملہ اصناف کو دھر گھسیٹا اور صاف صاف لکھ دیا کہ یہ بالکل خرافات چیزیں ہیں اگر قومی خدمت کے کام نہ آئیں۔ البتہ غزل پر زیادہ زور اس لئے صرف

کیا کہ اس گئر قسم کی عیاشی صنف میں بگڑنے کے لچھن سب سے زیادہ تھے اور داغ کی صحبت میں تو یہ بالکل 'کوٹھے' سے اُترنا ہی بھول گئی تھی۔

مولانا حالی نے جس نئی غزل کی طرح اندازی کی اس کی بنیاد واردات حسن و عشق کی عیاشی کے بجائے قومی خدمت کے اصول پر رکھی گئی۔

؎ کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

سلیم احمد سمجھتے ہیں کہ حالی کو نوجوانوں کے مسائل کا علم نہ تھا یا پھر وہ ان کے جنسی مسائل نظر انداز کرتے ہوئے 'نئی غزل' کو پروان چڑھانا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں 'کچھ کر لو' سے وہ سر سید احمد خان کی تحریک کی حمایت اور فروغ سے مراد لیتے ہیں جس کے نتیجے میں سرکار انگلشیہ میں ملازمت یقینی ہو جاتی تھی۔ سلیم احمد نے ان مباحث میں اپنی طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور حالی کے ادبی نظریات کو اپنی برہنہ تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ان کی شخصیت، لباس اور عادات پر بھی ناقدرانہ اظہار خیال کیا ہے۔

سلیم کا کہنا ہے کہ ہندوستان سے ہمارے رسم و رواج، ادب و ثقافت کو تباہ کرنے میں مولانا حالی کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ ان کے نزدیک حالی کی شاعری عشقیہ اور گھٹیا جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے تو عشقیہ شاعری بہت ہی پسند کی جاتی تھی مگر جب حالی نے شاعری شروع کی تو مسلمانوں کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ قوم تباہی اور بدحالی کا شکار ہو چکی تھی ایسی صورت میں حالی کی عشقیہ شاعری شعور اور صلاحیت سے محروم ہے۔ جبکہ حالی کا کہنا تھا کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں

اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسے شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا۔

سلیم اور حالی کے نظریات اپنی اپنی جگہ مگر حالی کی قومی شاعری کو جس طرح سلیم صاحب نے حقارت کی نظروں سے دیکھا ہے وہ سلیم کے شریفانہ جذبات کے اظہار، ادب پرستی، انسانیت دوستی اور تہذیب پرستی پر ایک بدنما داغ ہے۔ میں سلیم احمد کے اس خیال سے متفق ہوں کہ اختر شیرانی جو اردو شاعری کا سب سے پہلا رومانی شاعر ہے اس نے اس وقت اپنا چراغ جلایا جب اقبال اور جوش جیسے شاعر اپنے عروج پر تھے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اختر کی شاعری اور شخصیت دونوں میں افسانہ بن جانے کی صلاحیت موجود تھی مگر اس کے باوجود بھی انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کے قومی تشخص اور انہیں غلامی سے نجات دلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ عشقیہ شاعری سے مسلمانوں کو تاریکی کی راہ پر گامزن کیا۔

سلیم احمد کا یہ الزام تو اختر شیرانی کے لئے بالکل درست ہے لیکن حالی کے لئے انہی خیالات اور جذبات کا اظہار کہ انہوں نے اپنی شاعری سے مسلمانوں کو غفلت اور تاریکی کی طرف گامزن کیا بالکل غلط ہے۔ حالی کی شخصیت ایسی ہے جنہیں ہم باقاعدہ طور پر سب سے پہلا قومی شاعر تسلیم کر سکتے ہیں۔ انہوں نے "مسدس مدو جزر اسلام" لکھا۔ اس مسدس میں انہوں نے مسلمان قوم کے عروج و زوال کو بیان کیا ہے۔ مسلمانوں کے علمی شوق، بہادری، عدل و انصاف کے بیان کے بعد موجودہ دور کے مسلمانوں کی ذلت و پستی کا ذکر کیا ہے اور

اس کے بعد اس تنزل کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے انہوں نے نہ صرف مسدس میں قوم اور قومی مسائل کو بیان کیا ہے بلکہ ان کے قطعات، رباعیات اور مختلف نظموں میں اس کا بھرپور اثر ملتا ہے۔ ان کے مزاج میں خلوص اور صداقت ہے انسانیت کیلئے دردمندی ہے۔ وہ فرد اور معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں۔ مولانا کا شریفانہ لب و لہجہ، ان کا مشفقانہ انداز، نرم اور سبک تحریر میں قوم کے دکھ اور غم میں بہنے والے آنسوؤں کی نمی، یہ سب مل کر ان کے اسلوب کو ایک ایسی انفرادیت عطا کرتے ہیں جو صرف حالی اور حالی کے اسلوب ہی کو متعین کرتی ہے اور یہی اسلوب اب تک ہمارے حال اور ماضی کو پیوستہ کئے ہوئے ہے۔ حالی کی تحریروں میں ان کی ذات کا عکس ملتا ہے۔ ان کی طرز تحریر میں ایک پختگی ہے ایک روایت کی پرورش ہے، ایک نیا پن، جدت اور ایک تازگی ہے۔ مولانا نے بہت عمدگی و خوبصورتی کے ساتھ اردو زبان کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں مگر سلیم احمد کا ناقدرانہ رویّہ حالی کے ساتھ بہت ہی نامناسب اور توہین آمیز ہے۔ انہوں نے حالی کی شاعری پر ایسا رویّہ اختیار کر کے قومی شعرا کی توہین کی ہے۔ سلیم احمد ہمارے عہد میں کلاسیکی وضعداری اور پاسداری کا نشان ہیں۔ آج ان کی ٹوٹتی بکھرتی زندگی میں کسی پرانے قلعے کی سی پائیداری قائم رکھنا بڑی بات ہے۔

سلیم احمد نے جو تجزیہ کیا ہے وہ کافی حد تک درست ہے۔ ان کے ان چار مضامین سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو کے صد سالہ ادب کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور اس سے متعلق اپنے تاثرات مختصر طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال انہوں نے اپنے ذاتی خیالات اور نظریات پیش

کئے ہیں۔ اس لئے آزادیٔ تحریر کے پیشِ نظر ان کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مناسب موقعوں پر عیب پوشی سے بھی کام لیں۔ لیکن ان سے یہ درخواست ضرور کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اشہبِ فکر کو کسی عظیم شاہراہ کی بجائے کسی پگڈنڈی پر نہ دوڑائیں۔

سلیم احمد کی اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب کے موجودہ دور کے طالب علم کے لئے اشد ضروری ہے۔ نظریات سے قطع نظر ان مضامین میں جو سرسری حوالے دیئے گئے ہیں وہ اردو ادب کے ایک طالب علم کی کافی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

(ہفت روزہ 'جھنکار' کراچی، اپریل ۱۹۶۴ء)

—○○○—

شاخسار

۶۔ دسمبر ہفتہ کا دن تھا، دفتر سے چھٹی تھی لیکن جی بہت بوجھل تھا، اس وجہ سے نہیں کہ کام کی یکسانیت سے طبیعت اکتا گئی تھی یا روزمرہ کے معمول معطل ہو جانے کے سبب فرصت کا وقت کاٹنا مشکل مرحلہ بن گیا تھا۔ قلمکار تو روز و شب مصروف ہی رہتا ہے۔ غمِ جاناں، غمِ معاش، غمِ دوراں اور فکرِ فردا اس کے اعصاب پر ہمیشہ ہی سوار رہتے ہیں۔ بسا اوقات خواہشات اپنا سر اٹھاتے ہوئے اطمینانِ قلب کو ذہنی انتشار میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یوں تو ناکامیاں، ناامیدیاں اور مایوسیاں آج کے تیز رفتار مادہ پرست اور انفرادیت پسند معاشرے کا ثمر ہیں لیکن میں اس لمحہ کی اپنی دلی کیفیت کے بارے میں واضح انداز میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایسے ہی ماحول میں گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی اور میں نے دیکھا کہ میرے ایک دیرینہ کرم فرما شکیل فاروقی، ایک درویش صفت مہمان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ انہیں دیکھ کر پہلے تو اس خیال نے ستایا کہ میں انہیں اپنے آشیانہ میں کہاں بٹھاؤں۔ لیکن آئے ہوئے مہمان کو دروازے سے لوٹانا بھی اچھا نہ لگا کیونکہ یہ ہماری مشرقی تہذیب خصوصاً مسلم ثقافت کا شیوہ نہیں۔ لہٰذا فلیٹ کے ایک کونے میں جا بیٹھے اور ابتدائی علیک سلیک کے دوران ہی مجھے اندازہ ہوا کہ فاروقی صاحب کے ہمراہی، جو بظاہر متانت

سنجیدگی اور سادگی کے پیکر۔ صوفی منش اور قلندرانہ صفت معلوم ہو رہے تھے ایک دردمند دل کے مالک، رنج والم کے پہاڑوں کو عزم و ولولہ اور صبر و رضا کے تیشہ سے پھاڑ دینے والے فرہادی صفت انسان ہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص محبت سے اپنا مجموعۂ غزلیات 'شاخسار' عنایت کیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ مشیتِ ایزدی اور فطرتِ انسانی ہے کہ مونث سے پیار ہو۔ میرے خیال میں کوئی کتاب بُری نہیں ہوتی۔ جس طرح نیاز فتحپوری مرحوم نے لکھا ہے کہ کوئی عورت بدشکل نہیں ہوتی۔

لیکن جب انہوں نے 'شاخسار' پر کچھ لکھنے کو فرمایا تو ساری خوشی سراسیمگی میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے معذرت کی لیکن وہ نہ مانے۔ انہوں نے 'اظہار' کے اوراق کے مطالعے سے موجودہ ادبی کساد بازاری کے دور میں میرے بارے میں حسنِ ظن اپنے حافظے کے خزانہ میں محفوظ کیا تھا۔ یہ ان کے دل کے غنی ہونے کی دلیل ہے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ نرینہ اولاد کی تمنا نے مجھے آج سے ۴۵ سال پہلے شاعری جیسی لطیف صنف سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ میری اولاد پوری کرکٹ الیون ہے لیکن خود اختیاری ہجر و فرقت کی کیفیت بدستور قائم ہے۔ کہتا نہیں، پڑھتا ضرور ہوں اور اچھے اشعار سے محظوظ بھی ہوتا ہوں یعنی رفیقانہ رابطہ جاری ہے۔

یہ غنی دہلوی تھے جن سے میں پہلے کبھی ملا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔ دہلی کے حوالے سے تو حکیم محمد سعید 'ہمدرد' والے، فلمی ماہنامے 'شمع' والے، بذاتِ فضلِ ربّی کے پاکستانی منظاہر دنیا جہاں والے، سوداگرانِ جرم اور اللہ والوں سے لیکر

سوداگرانِ بارود تک تو مشہور و معروف ہیں لیکن ان کاروباری افراد اور گروہوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ عزم و حوصلہ ان کی زندگی کا شعار رہا اور غیرت و خودداری کے وہ دلدادہ رہے۔ انہیں اپنی عنانِ نفس پر مکمل گرفت ہے۔ صوفیوں کی طرح ان کی آنکھوں میں سچائی اور انسان دوستی کی روشنی جھلک رہی تھی۔

مقامِ انکساری کیا ہے اک قربِ خداوندی
خدا کو جب بھی پایا جس نے پایا سرنگوں ہو کر

مجھے یکایک خیال ہوا کہ اگر میں مسٹر دہلوی کے 'نہاری مشاعرہ' میں محض ناشتہ کی غرض سے ہی شریک ہوتا تو شاید غنی دہلوی سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ یہ دونوں بزرگ بعض شاہراہوں کی منقسم المزاجی کی وجہ سے قطبِ جنوبی اور قطبِ شمالی کی طرح ایک دوسرے سے بظاہر اور بباطن دُور معلوم ہوتے ہیں۔

یہ محترم چند ساعتوں کے بعد چلے گئے اور مجھے ایک عجیب مخمصے میں ڈال گئے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اردو کا ابتدائی تعارف، دربار اور چھاؤنی کی لونڈی کے طور پر ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی زیب و زینت اور حسن و رعنائی میں اضافہ ہوتا رہا۔ خدا نے اسے ایسی حیاتِ جاوداں عطا فرمائی کہ صدیاں بیت گئیں لیکن اس کے حسن و جوانی، دوشیزگی و تابندگی، دلبری اور دلربائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میرے آقا و مولیٰ نے لونڈیوں کے ساتھ اچھا سلوک برتنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن شریف نے زبانوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات ہونے کا شرف عطا کیا ہے۔ میں بھی اردو کی محبوبیت کا قائل ہوں۔ اس کی اثر پذیری، افادیت اور عالمی ضرورت اور اہمیت کا منکر نہیں۔ لیکن پاکستان کی قومی زبان ہونے کے ناتے سے گیسوئے

اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے۔ علاوہ ازیں اپنی علمی کم مائیگی کے احساس کی وجہ سے مجھے اپنے دعوئ عاشقی کے برملا اظہار میں تامل رہا ہے اور آج بھی یہی اندیشہ ہے کہ کہیں بھری بزم میں بے ادبی کی بات کہنے کا سزاوار نہ ٹھہرایا جاؤں۔

بہرحال، کتاب کھولی، علامہ اقبال کے نام انتساب دیکھ کر کتاب کو جستہ جستہ پڑھا اور ایک نیا جہانِ سخن میری نظروں میں وا ہونے لگا۔ سخن وری کے ثمردار درختوں اور سخن سنجی کی رنگا رنگ پھولدار ٹہنیوں نے میری بوجھل طبیعت کو بحال کر دیا اور ذہنی آسودگی کا احساس ہونے لگا۔ ایک ہی نشست میں غنی صاحب کے سرمایۂ افکار کا جائزہ لے لیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل ہے اور ذہن جواہرِ سخن کے ذخائر سے مالامال ہے۔

'شاخسار' میں چند ایسی غزلیں ہیں جو غنی دہلوی کی آپ بیتی کی مظہر ہیں اور کافی غزلیں بڑے بڑے غزل گو شعرا کی زمینوں میں اور طرحی مشاعروں کے سلسلے میں کہی ہوئی شامل ہیں لیکن انہوں نے نہایت کامیابی سے اپنی بات اپنے ہی انداز میں کہی ہے اور قافیہ پیمائی کے بجائے معنی آفرینی پر نظر رکھی ہے۔ نیز ان کے یہاں جدتِ خیال، جدتِ بیان اور جدتِ ادا کے ساتھ ہمہ قسم کی جدتیں ملتی ہیں جو اُن کے سخن فہم ہونے کی دلیل ہیں۔ ان کے اندازِ سخن میں نظیر اکبر آبادی کی سادگی اور ڈاکٹر اقبال کا رنگ نظر آیا۔ مجھے ان کی شخصیت کی طرح ان کے کلام نے بھی بہت متاثر اور مرعوب کیا۔ چنانچہ آج کی تقریب میں جو کچھ عرض کروں گا اسے اسی ہی احساس کا ردِعمل سمجھنا چاہیئے۔

غزل کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ یہ اردو شاعری کی آبرو

ہے۔ لیکن کلیم الدین احمد اسے نیم وحشیانہ صنفِ سخن بتاتے ہیں۔ غزل سے شکایت سب سے پہلے غالب نے کی تھی۔ وہ کہتے تھے ان کے لئے تنگنائے غزل کافی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہیئے۔ شاید اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ نئے حالات میں جن مضامین کا اظہار ضروری ہے اس کے لئے غزل کی صنف چھوٹی پڑ جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غالب کی یہ شکایت دراصل غزل سے گلہ نہیں بلکہ یہ تو ایک طرح کا گریز ہے۔

ہمارے ادب کی دنیا میں صرف غزل ہی کا ایسا میدان ہے جہاں بلا تخصیص ہر فرد نے اپنے اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں، کچھ چابک سوار ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے بڑی بڑی راہوں کو ہموار کیا ہے۔ اس راہ سے ایسے ایسے مشاق اور تیز رفتار راہرو گزر چکے ہیں کہ نہ صرف ہماری شاعری میں ان کا نام و مرتبہ بہت بلند ہے بلکہ ادبی اعتبار سے بھی جریدۂ عالم پر اُن کا نام ثبت ہے۔ ایک نئے جادۂ پیما کے لئے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ بھی چلے اور ان سے ہٹ کر ایک نیا راستہ بھی بنا لے۔

موجودہ صنعتی معاشرہ میں پرانے انسانی رشتے اور معیار جھوٹے پڑ گئے ہیں اور نئے رشتے دریافت نہیں ہو سکے ہیں جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسے خوف کی تاریکیوں نے گھیر لیا ہے اور وہ بے یقینی اور عدم تحفظ کے جان لیوا عذاب میں مبتلا ہے۔ خوف، بے یقینی اور تنہائی کے احساسات جس طرح ہماری غزل میں اظہار پا رہے ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کا دامن کسی بھی قسم کے مضامین کے اظہار کے لئے تنگ نہیں ہے، ہاں بات

اگر صرف ضد کی ہے تو پھر مجبوری ہے۔ آپ جو چاہیں غزل کو کہیں وہ بے چاری آپ سے لڑنے سے تو رہی۔

غنی دہلوی کو قدرت نے ایک فلسفی کا سنجیدہ مزاج اور ایک شاعر کی رعنائیٔ خیال عطا کی ہے۔ ان کی طبیعت جلوت کے مقابلے میں خلوت سے زیادہ مانوس ہے، غنی دہلوی کی ذہنیت کا تصور کرنے کے لئے ایک ایسی شخصیت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جس سے سنجیدگی کے منافی تمام عناصر خارج کر دیئے گئے ہوں اور اس طرح ہمارے سامنے ایک ایسی ہستی آجاتی ہے جو تمام تر متانت لئے ہوئے ہو۔ علم و عرفان اور داخلیت ایسے عناصر ہیں جن کا اجتماع صرف ایک پیکرِ تمکین ہی پیش کر سکتا ہے جس کی امتیازی خصوصیت توازن اور اعتدال ہو۔ طبیعت کا یہ ٹھہراؤ ان کی شاعری پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ ان کی قوتِ رعنائی کا سبب ان کی متانت ہے۔ اس لئے انہیں اُن راہوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں جن سے کہیں حکیم یا نکتہ داں کا دامن آلودہ ہو سکے۔ وہ اپنے اور واردات کے درمیان ایک فاصلہ رکھ کر ان کا بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے اس بیان کی حیثیت تنقیدِ واردات کی ہو جاتی ہے۔ مثلاً

معیارِ عشق کم نہیں معیارِ حُسن سے
ہم جس پہ تُل رہے ہیں وہ کانٹا تمہیں تو ہو

وہ اپنے وارداتِ غم کا اظہار براہِ راست نہیں کرتے، اس کے لئے ایک معقول جواز اور فلسفیانہ سہارا تلاش کرتے ہیں ؎

یہ سب کچھ محبت کی مجبوریاں ہیں
غنی کون مٹتا ہے اپنی خوشی سے

ان کا صوفیانہ مذاق بہشتِ بریں سے نظر ہٹا کر جب بہشتِ ارض کے جلوہ ہائے رنگ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس میں بھی ان کی انفرادیت یعنی متانت اور اعتدال پسندی ان کے عنانِ خیال کو کھینچتی رہتی ہے ؎

تم اپنی زلف کو رہنے دو اپنے روئے تاباں پر
بلا سے بحث چھڑ جائے جہاں میں کفر و ایماں پر

غنی کا اپنا ایک خاص لہجہ ہے اور ان کے شاعرانہ کمال کے اظہار کے لئے اس سے بہتر اور کوئی لہجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ایک رکھ رکھاؤ اور بے ساختہ پن ہے ؎

موجِ دریا ہے زندگی کا لہو — کتنا ارزاں ہے آدمی کا لہو
بس یہی انکشاف کافی ہے — ہے کس ہاتھ پہ کس کا لہو

لیکن ان کا عشق مریض ذہن اور خستہ روح کا عشق نہیں۔ اس میں لطافت ہے رنگینی ہے، شگفتگی ہے ؎

سب کچھ نثارِ حسنِ ابد ہم نے کر دیا — فکرِ مآلِ کار کو رَد ہم نے کر دیا
حسنِ نگاہِ عشق کی رنگینیاں نہ پوچھ — ہر برگِ گل کو غیرتِ خد ہم نے کر دیا
عشق و جنوں کی راہ میں اب کشمکش نہیں — دل کو امیرِ ہوش و خرد ہم نے کر دیا

حسن و عشق کے بیان میں اچھے اچھے فنکار عام روش پر چل نکلتے ہیں لیکن غنی نے عشق کی پاکیزگی کو آنچ نہیں آنے دی جس کی وجہ سے ان کے کلام میں خیال کی بلندی اور جذبات کی سلاست کے ساتھ بڑی خوشگوار پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔

غنی دہلوی کا رنگِ تغزل ان کے داخلی و خارجی مشاہدات و محرکات، وسیع تجربوں، عمیق احساسات کے مختلف النوع اظہار سے عبارت ہے۔ اس اظہار کے حوالے سے ہمیں "شاخسار" میں معصومیت، سادگی، نفاستِ طبع اور پاکیزگیٔ فکر کے گوناگوں زاویئے نظر آتے ہیں۔ ان زاویوں کی روشنی میں ہم ان کی شاعری کو ایک سچی اور بے ساختہ شاعری کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ طویل اور مختصر دونوں بحروں میں شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن مختصر بحروں کے اشعار میں روانی، برجستگی، سلاست اور لطافت قابلِ تحسین ہے۔ وہ آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اور دل سے جو محسوس کرتے ہیں وہی ان کا موضوعِ سخن ہے بالفاظِ دیگر حیاتِ کائنات کی جلوہ سامانی اور گرد و پیش کے ماحول کی ترجمانی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے، وہ خلوص اور سچائی کے ساتھ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں تو عجیب لگتا ہے کہ اس عہد کے شہرت کے بھوکے شاعروں کے درمیان رہتے ہوئے غنی دہلوی کو نہ منفرد شاعر بننے کا ہوکا ہے اور نہ اچھوتے طرزِ احساس کو اپنانے کا جنون۔ شاعری کے بغیر وہ سانس تو لے سکتے ہیں لیکن زندگی نہیں گزار سکتے۔ عہدِ حاضر سے وہ بے تعلق نہیں ہیں۔ جا بجا عہدِ حاضر کے غموں کا تصہ بھی انہوں نے چھیڑا ہے لیکن اس قصے میں ایک ایسی تہذیب اور اس کے ماضی و مستقبل سے ان کی وابستگی ہے جہاں شاعری زندہ تھی اور رہے گی۔ غنی کی شاعری میں آنکھوں کی توانائی اور مقصد و منہاج کی برنائی ایک نقطے پر جمع ہو گئی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری براہِ راست اور واضح ہے۔ وہ اندرونِ ذات کی بھول بھلیوں اور اظہار و ابلاغ کی پیچیدگیوں اور الجھنوں سے پاک ہے اور

قاری کو شعر کی تہہ تک پہنچنے میں ذہنی ورزش کی ضرورت نہیں۔ آپ نے جس دیانتداری سے اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے، جس بے باکی سے وارداتِ قلبی بیان کی ہے وہ آپ کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

"شاخسار" میں حسن و عشق، علم و حکمت، رزم و بزم اس طرح شیر و شکر ہیں کہ کسی کو کسی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے دل کی دھڑکن میں ساری کائنات کے دکھ درد اور دکھی انسانیت کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ ان کے اشعار میں اُن ہی کی آواز نہیں ہے بلکہ یہ ہر دردمند دل کی آواز ہے۔ ان کی غزل اُلجھنوں اور بھاری فلسفوں کی قید سے آزاد ہے۔ وہ زیادہ گہرائی میں نہ تو جاتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ شاید یہ بھی ان کی انفرادیت ہی ہے کہ وہ غزل کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ لیکن ان کے ہاں قلبی واردات اپنے پورے احساسات کے ساتھ اور اپنے مخصوص رنگ میں موجود ہے جو دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔

غنی صاحب نے دورِ حاضر کی غزل کو ایک مقبول اسلوب دیا ہے جو اُن کی اپنی افتادِ طبیعت کی پیداوار ہے، لیکن ان کا یہ کارنامہ ایک فنکار کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ صوتی اور صُوری حسن کے پیشِ نظر الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت زیادہ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے وضع نہیں کئے بلکہ اپنے پرانے ہیشہ سے رائج الفاظ کو سلیقے سے پہلو بہ پہلو ترتیب دیا ہے لیکن غیر مرئی طور پر ان الفاظ میں احساس کی ایسی تڑپتی ہوئی لہر دوڑ جاتی ہے جو رُوح کے تاروں کو جھنجھنا دیتی ہے۔

(پاک۔امریکن سینٹر (کراچی) میں منعقدہ تقریب تعارف کے لئے لکھا گیا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۸۰ء)

دیدۂ خوش خواب

عموماً لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ شعر و ادب کا چسکا کوئی اچھی عادت نہیں اور یہ عموماً وہی لوگ کہتے ہیں جن میں ادبی ذوق کا فقدان ہوتا ہے ۔ ادیب اور شاعر کو اس اضافی ذمہ داری سے شہرت تو مل جاتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس شہرت کے معاملے میں سب ایک جیسے نہیں ہوتے مگر معمولی شہرت بھی کچھ اہم نہیں ۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو ہمارے یہاں ہر تیسرا آدمی ادیب اور شاعر ہونے کا دعویدار نہیں ہوتا ۔ ممکن ہے اس کثرت کا سبب تسکین کا عمل ہو ۔ کیونکہ ماہرین نفسیات کے نزدیک شعر و ادب تسکین حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں ۔ دراصل شاعری کا مسئلہ آج کی دنیا میں (بالخصوص تیسری دنیا میں) ایک پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے ۔

ترقی یافتہ ممالک میں شاعری اپنی جدید تکنیکی خصوصیات اور تجربہ کی گمبھیرتا کے سبب عام قاری سے اپنا رشتہ قائم نہیں رکھ سکی ہے لیکن اس کے باوجود بھی شاعری اور سماج ایک اٹوٹ رشتے میں منسلک ہیں اس لئے شعرا کی توجہ از سر نو ابلاغ کی طرف جاتی ہے اور اس اثنا میں قارئین نئی تکنیکوں کی اجنبیت کو مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھتے مگر تیسری دنیا

میں شاعری کے مسائل زیادہ گمبھیر ہیں کیونکہ بیشتر ملکوں میں معاشرہ کی سطح ناہموار ہے اور اسلوب زندگی کی بنیادی یک رنگی ناپید ہے ۔ ہمارے یہاں شاعری کے بارے میں متضاد نظریات بھی چلتے ہیں جس سے ادب میں دلچسپی گمبھیرتا اور عمق پیدا ہوتا ہے اور جو لکھنے والے اپنے تجربات میں سب کچھ سمو سکیں وہ یقیناً ادب کے اعلیٰ ایوان میں باعزت مقام پا سکتے ہیں ۔

زیر تبصرہ کتاب 'دیدۂ خوش خواب' جناب رفیع الدین راز کا مجموعہ کلام ہے جو ظاہری اور معنوی خوبیوں سے پوری طرح آراستہ ہے ۔ ان کے اشعار سے ہر خاص و عام آدمی کے ذوق کو تسکین ہوگی ۔ ان میں خلوص کی خوشبو، جذبات کی جولانی، فکر کی فراوانی، زبان کا زور، سادگی کا سحر، الفاظ کا اُتار چڑھاؤ، مشاہدات کی مہک، داخلیت کا دکھ اور خارجیت کی خوبی سب کچھ موجود ہے ۔

زیست کو منظرِ عبرت نہ بنا
خود پرستی کو عبادت نہ بنا

زندگی شیشہ صفت کیا ہوتی
درد جب آئینہ صورت نہ بنا

جبر کو صبر سمجھنے والے
اتنی سفاک طبیعت نہ بنا

اس نے کوشش تو بہت کی لیکن
آئینہ حسبِ ضرورت نہ بنا

جہاں تک رازؔ کے لہجے کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزل کی شاعری کا لہجہ اردو شاعری کے نرم و سبک لہجوں میں ایک معتبر اضافہ ہے۔ رازؔ کا لہجہ حقیقتاً صنعتی عہد کا ایک نرم و نازک لہجہ ہے جس میں زندگی کے بڑے دکھ اور انسان کے پیچیدہ نفسیاتی پہلوؤں کو نرمی اور گداز کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں نرم لہجوں میں ایک نئے لہجے کی تخلیق کی ہے جو موم اور برف کی طرح پگھلتا ہوا ہے ؎

وسوسہ جب دلوں میں پلتا ہے
برف چھونے سے ہاتھ جلتا ہے

بارِ ہستی کی شکل میں انسان
آسماں سر پر لے کے چلتا ہے

بات ہوتی ہے صرف حدت کی
موم کیا سنگ بھی پگھلتا ہے

رازؔ کی نظر میں شعر کے لئے اول و آخر شرط شعریت ہے جو ان کے مجموعہ کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔ شعریت کی سب سے بڑی خصوصیت تاثیر و اثر ہے جو احساس کی نزاکت و لطافت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ شعر کو شعریت تاثیر کی دولت بخشنے والی کیفیت مسرت سے زیادہ غم کی امین اور بعض موقعوں پر مسرت کے بجائے غم کا عطیہ ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے رازؔ نے اس تاثیر کے لئے ایک دکھ بھری طبیعت اور دکھا ہوا دل قبول کیا ہے۔ رازؔ کے غم کی یہ ہمہ گیری یک جہتی

اور یگانگت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی ؎

خود فریبی کا سلسلہ ٹوٹا
سانس ٹوٹی کہ آئینہ ٹوٹا

قصرِ دامِ فریب کیا ٹوٹا
ایک تراشیدہ بت کدہ ٹوٹا

خواب بکھرے نہ حوصلہ ٹوٹا
میں کہ اندر سے بارہا ٹوٹا

حادثہ اس نے بڑھ کے کیا ہوگا
آئینہ اور بے صدا ٹوٹا

ایک اور جگہ اس کیفیت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں ؎

لہو میں رقص کرتا موسمِ شوریدہ سر آیا
عجب انداز سے اس بار خوشبو کا سفر آیا

تھکے ہارے پرندے جب بھی آکر شاخ پر بیٹھے
مجھے صحراؤں میں آواز دینے میرا گھر آیا

رگوں میں وحشتیں جاگیں نہ آنکھوں سے لہو ٹپکا
تمہاری یاد کا موسم بھی اب کے بے ثمر آیا

رازؔ کی شاعری نہ لفظوں کی بازی گری ہے اور نہ تخیل کی تماش بینی۔ ان کی شاعری سیدھی سچی اور ابہام سے پاک شاعری ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں نہ کوئی فلسفہ بگھارتے ہیں نہ پیغام دیتے

ہیں اور نہ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ ایسے جذبوں کو زبان دیتے ہیں جو ہر دور میں شاعری کی اساس رہتے ہیں۔ رازؔ کے لئے شاعری ایک مقدس شے ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے شعروں میں ایک پُراسرار تقدس اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں اشلوک جیسی شیرینی اور رچاؤ ہے۔ نرم و رواں زبان، سبک الفاظ اور ایک ایسی فضا شعروں میں ملتی ہے جو کائنات سے ماورا کا تصور ذہن میں ابھارتی ہے۔

رازؔ صاحب کے مجموعہ کلام کے مطالعے سے بخوبی واضح ہے کہ وہ طویل اور مختصر دونوں بحروں میں شعر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں لیکن مختصر بحروں کے اشعار میں روانی اور برجستگی، سلاست اور لطافت قابلِ تحسین ہے۔ وہ آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اور دل سے جو کچھ سنتے اور محسوس کرتے ہیں وہی ان کا موضوعِ سخن ہے۔ بالفاظِ دیگر حیات و کائنات کی جلوہ سامانی اور گرد و پیش کے ماحول کی ترجمانی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ رازؔ کا رنگِ تغزل ان کی داخلی و خارجی مشاہدات و محرکات وسیع تجربوں، عمیق احساسات کے مختلف النوع اظہار سے عبارت ہے۔ اس اظہار کے حوالے سے ہمیں ان کے مجموعہ کلام میں معصومیت، سادگی، نفاستِ طبع اور پاکیزگیِ فکر کے گوناگوں زاویے نظر آتے ہیں۔ ان زاویوں کی روشنی میں ہم ان کی شاعری کو ایک سچی اور بے ساختہ شاعری کا نام دے سکتے ہیں۔ (اکتوبر ۱۹۸۸ء)

پاکستان زندہ باد

ہماری ادبی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا جزوِ لازم ہے۔ پاکستان کا قیام ملّت کے سیاسی نصب العین کی تکمیل تھی۔ لیکن اس سیاسی فتح کے لئے قومی ذہن اور قومی کردار کو کب سے اور کس کس طرح تیار کیا جا رہا، اس جدوجہد کے لئے نثری مطبوعات کے ساتھ ساتھ شاعری پر بھی نظر کرنا ضروری ہے۔ ہماری شاعری تمام تر حسن و عشق کی شاعری نہیں جسے اکثر 'فراریت' کا نام بھی دیا جاتا رہا۔ کیونکہ محض تغزل ہی ہماری شاعری کا سرمایہ نہیں۔ گو غزل بھی نہ صرف مادی حالات سے متاثر بلکہ کسی حد تک سیاست کی طرف مائل رہی ہے۔ ہم آسانی سے دنیا کی کسی اور زبان کا نام نہیں لے سکتے جس میں اتنا بڑا ذخیرہ ایسی نظم کا موجود ہو جو قومی جوش و خروش حریت پسندی کے جذبات اور سیاسی مقاصد کے شعور سے اس حد تک بھرا ہوا ہو۔ ہمارے ادب پر سیاسی زندگی کا اتنا بھرپور اثر اور واضح پرتو موجود ہے کہ ادب کی تاریخ سیاسی تاریخ کا خلاصہ نظر آتی ہے۔ یہی اجتماعی فطرت کا تقاضا بھی تھا اور حقیقت اس سے زیادہ ہی روشن ہے جتنا بعض اوقات سمجھا جاتا ہے۔

ہماری قوم ۱۹۴۷ء سے پہلے کے طویل دورِ محکومی میں بھی بے زبان

نہ رہی تھی ، جبکہ جذباتِ حریت کے لئے کھُل کھیلنے کا موقع نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد تو گویا قومی شاعری کا بند کھُل پڑا۔ برطانوی ہند کے طول و عرض میں کوئی ایسا مسلمان شاعر نہ تھا جو قوم کے درد میں مبتلا نہ رہا ہو۔ موجودہ صدی نے تو اس شاعر کو شاعری کی شریعت سے ہی خارج سمجھا جو شعوری طور پر آزادی کا نام لیوا نہ ہو۔ اس طرح ہماری حُسن و محبت کی شاعری ، جادہ و منزل کی شاعری کے لئے وجہ جواز ہو کر رہ گئی۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے سب سے مقبول ، سب سے ممتاز شعرا کی فہرست دیکھئے جن کا ایک ایک سانس قوم کی دردمندی کے لئے وقف تھا اور ان کی تخلیقات سے ، جو قومی ادب کا عزیز سرمایہ ہیں ، نظر آتا ہے کہ قومی شاعری کوئی سرسری تحریک یا ادبی دھارے کی صرف ایک موج نہ تھی ، بلکہ اس کی رفتار کا رُخ واضح طور پر قومی تشخص کو نمایاں کرنا اور پروان چڑھانا تھا۔ یہ اُن کا ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے غلامی و بے مرامی کے حالات میں قوم کے سرِ افتخار کو بلند رکھا اور اس کے نصب العین کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور اُس عالم میں بھی کہ ؎

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا (حالیؔ)

مسلمان من حیث القوم اپنے کو انگریز حاکم اور برادرانِ ہنود سے افضل جانتا تھا۔

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

(اقبال: بانگِ درا ، طلوعِ اسلام)

آزادی کے بعد اس جوشِ اظہار میں ایک نیا اُبال آیا جس میں خروشِ نشاط اور مستقبل کے حسین خوابوں کے ساتھ ساتھ قومی مسائل کا شعور اور نئے مراحل کا چرچا بھی نظر آتا ہے۔ اُس میں والہانہ نغمے بھی ہیں ، مجاہدانہ نعرے بھی اور سب سے بڑھ کر وہ احساسِ تشنگی و ناتمامی جو زندگی کی پہچان اور تمام ترقی کی جان ہے۔

(اقتباسات بالاختصار از شان الحق حقی: نشیدِ حریت ، کراچی۔ ۱۹۶۴ء)

آج کی صحبت میں مجھے قومی شاعری کا انتخاب یا اُس سے متعلق اپنی ناقدانہ رائے پیش کرنی نہیں۔ پاکستانی ادب کا عرصۂ حیات ' چہل سال عمرِ عزیزت گزشت ' ابھی تو اُس کی نوک پلک سنور رہی ہے اور اُسے بڑی مشاقی اور مشاقگی سے سنوارنے والے الحمدللہ چند بزرگ ضرور ہیں۔ وہ جانے پہچانے ہیں۔ اُن کے اسمائے گرامی کی تکرار و تشہیر اس موقع پر تحصیلِ حاصل کیجئے۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کی عظمت پر گواہی کے لئے یہ عرصہ ناکافی ہے۔ اِسی جذبہ کے تحت ابُوالعلاء معرّی نے کہا تھا ۔ " ابھی میرے کلام پر وقت ہی کتنا گزرا ہے۔ زمانہ اس پر سے ہولے تب اس کا اندازہ کرنا"۔ سو مجھے امید فاضلی کی قومی نظموں کے مجموعے 'پاکستان زندہ باد' کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ ان دو الفاظ کے مرکب اور مکمل ، بامعنی اور بامقصد جملے سے میری شعوری زندگی وابستہ رہی ہے۔ فروری ۱۹۳۷ء میں سارے ہندوستان میں منعقدہ عام انتخابات کے دوران میں نے اپنے گاؤں کے امیدوار آغا شمس الدین خان بارکزئی کی ورکنگ میں 'جھنڈا اسلام کا ، آغا شمس الدین خان' کا نعرہ بلند کیا اور ۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو مقامی میونسپل لائبریری میں 'یوم پاکستان' کے سلسلے کی

تقریب میں "لے کے رہیں گے پاکستان" کا پُرعزم عہد کیا۔ ۲۴ مئی ۱۹۴۱ء کو سلطان کوٹ میں منعقدہ "سکھر ضلع مسلم لیگ کانفرنس" میں طالب العلم رضاکار کے طور پر شریک ہوا۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں جو "مسئلہ پاکستان" کے بارے میں استصواب کی حیثیت رکھتے تھے، سندھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رکن کی حیثیت میں سرگرمی سے شرکت کی، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریباتِ آزادی میں ایک پاکستانی طالب العلم کی حیثیت سے سرگرم حصہ لیا۔ ۱۹۶۵ء کی بھارتی جارحیت کے دوران شب خیزی کے عالم میں عزمِ مصمم اور پختہ یقین کے ساتھ فرائضِ منصبی ادا کئے اور ۱۹۷۱ء کے سانحہ پر خون کے آنسو بہائے تھے۔

اب جب میں ۱۴ دسمبر ۱۹۸۸ء کو ۴۱ برس ۵ ماہ مملکتِ پاکستان کی خدمت کرنے کے بعد اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو جاؤں گا تو میرا ضمیر مطمئن ہوگا کیونکہ پاکستان نے مجھے جو عزت و مرتبت کا مقام عطا کیا میں نے کماحقہٗ اس کا حق ادا کیا۔ ان ۱۵ ہزار ۱۱۹ دنوں کے دوران میں نے ۱۵ لاکھ سے بھی زائد الفاظ پر مشتمل مضامین لکھے۔ علاوہ ازیں تقریروں کے ذریعہ بھی میں نے نظریۂ پاکستان، ملک کے استحکام اور سلامتی، قومی یکجہتی اور اتحادِ عالمِ اسلام کے موضوعات پر نئی نسل کی آگاہی کے لئے خدمات انجام دیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر پاکستان قائم نہیں ہوتا تو میں کہیں منشی، پٹواری یا پرائمری ٹیچر ہوتا اور کوئی نمایاں خدمت سرانجام دیئے بغیر میری زندگی یونہی گزر جاتی۔ اسی طرح میں یہ بات بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ حضرات کی حالت بھی کچھ مختلف نہ ہوتی۔ اس لئے میں جب تک زندہ رہوں گا میری ہر سانس کے ساتھ

"پاکستان زندہ باد"، "پاکستان پائندہ باد" کا نعرہ ذکرِ جلی اور ذکرِ خفی کی طرح جاری رہے گا۔

جناب امید فاضلی یوں تو غزل اور مرثیے کے بے مثال شاعر ہیں، لیکن ان کی نظمیں اور نعتیں بھی اپنی جگہ شعری ادب میں بیش بہا اضافے کا موجب ہیں۔ ان کی شاعری میں بلا کی روانی، الفاظ کا چناؤ اور ان کی مناسب اور موزوں نشست ایسی ہے کہ جب وہ شعر کہتے ہیں تو سامعین پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جب ان کا شعر پڑھا جاتا ہے تو بھی اس میں وہی لطافت اور سرشاری محسوس ہوتی ہے۔

مجھے بے حد مسرت ہے کہ امید فاضلی جیسے قادر الکلام سخنور نے ہمیں مملکتِ خداداد پاکستان سے محبت کرنے اور اسے نبھانے کی زوردار منظوم دعوت دی ہے۔ اس کتاب کی نظمیں نہ صرف ان کی فکر و نظر کی غمازی کرتی ہیں بلکہ ہمیں بھی صدق و وفا کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دیتی ہیں۔

امید ایک منجھے ہوئے شاعر اور سخنوری کی تاریخ کے چھپے ہوئے رستم ہیں۔ ان کے مختلف نوع کے کلام کا مجموعی تجزیہ اور تاثر ان کی کہنہ مشقی اور لسانی آہنگ کی گواہی دیتا ہے۔ اہلِ کتاب اور اہلِ زبان تو تھے ہی، اب صاحبِ کتب بھی بن گئے ہیں۔ دریا آخر دریا ہے (غزلیں)، سرِ نینوا (مرثیے)، میرے آقا (نعتیں) اور مناقب شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ان کا پانچواں مجموعہ ہے۔ ان کی قومی شاعری کا مجموعہ "پاکستان زندہ باد" وطنِ عزیز سے ان کی والہانہ محبت کا آئینہ دار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان نظموں سے ہر خاص و عام

آدمی کے ذوق کی تسکین ہوگی، کیونکہ انہوں نے قوم کے خوابیدہ جذبات واحساسات کو جھنجھوڑ دیا ہے اور تخیل کی دنیا سے نکال کر سرتاپا پیکرِ فکر و عمل بننے پر مجبور کر دیا ہے، جیسے کہ اُن کی نظم بعنوان "ہم ایک ہیں" سے تاثر ملتا ہے ؎

تقدیسِ وطن کے لئے خون نذر کریں گے
ہم ایک ہیں ہر حال میں ایک رہیں گے

یہ قومی نغمے اُن کی غیر معمولی ذہنی و قلبی واردات کے مظہر ہیں۔ ان کے یہاں جذب و شوق، گہرائی و گیرائی، جوش و ہوش، جنون و ادراک اور جلال و جمال کی متضاد صفات و کیفیات مکمل توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور انہوں نے یہ کتاب شائع کر کے اس دور میں "صلح کل" کے ایک مبلغ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

امید نے جو طرزِ بیان اختیار کیا ہے اس میں خیال کی رفعت اور کلام کی دلآویزی میں کچھ ایسا امتزاج قائم کر دیا ہے جس نے سخنوری کے متنوع پہلو آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو گئے ہیں۔ امید کے اس مجموعہ کلام پر سچے محسوسات و جذبات کا سائبان تنا ہوا ہے، جیسے کہ ان کی نظم "اے زمینِ وطن" سے تاثر ملتا ہے ؎

میرا تن، میرا من، میرا جیون ہے تو
میری آنکھوں کی لَو دل کی دھڑکن ہے تو
تیری خوشبو بدن کے گلابوں میں ہے
تیری رنگت دھنک کے نصابوں میں ہے

گھر اُجالوں کا گیتوں کا مسکن ہے تو
میرا تن، میرا من، میرا جیون ہے تو

ان کی شاعری ظاہری اور معنوی خوبیوں سے پوری طرح آراستہ ہے۔ اس میں خلوص کی خوشبو، جذبات کی جولانی، فکر کی فراوانی، زبان کا زور، مشاہدات کی مہک، سب ہی کچھ تو موجود ہے۔ امید گداز دل رکھنے والے انسان اور حساس شاعر ہیں۔ وہ ادبی دنیا کے اُن معدودے چند شعرا میں سے ہیں جو بیک وقت زبان و قلم پر قدرت رکھتے ہیں اور خوش خوانی میں بھی بے نظیر ہیں، وہ ایک ایسے فنکار ہیں جن کے بول کھرے اور میٹھے ہیں، الفاظ میں سچائی بھی ہے دل نشینی بھی۔ ان کی یہی خوبیاں ان کے مجموعہ کلام میں شگفتگی و لطافت کا سبب ہیں۔ وہ اپنی فکر کو شعری سانچوں میں ڈھال کر وطن کے لوگوں کو اُخوت و محبت کا پیغام دے رہے ہیں اور "پاکستان زندہ باد" کی نظمیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔ امید کے اشعار میں نہ صرف یہ کہ فکر و نظر کی بوقلمونی ملتی ہے بلکہ ان میں رنگ و نور و نکہت اور وطن سے محبت کی ایک دنیا آباد ہے، فکر کی ایک کہکشاں اُن کی نظم "آئینہ" میں نظر آتی ہے ؎

کیا آن ہماری تھی کہاں آج کھڑے ہیں
یک جان جو ہو جائیں تو ہم اب بھی بڑے ہیں
تاریخ کبھی چھوٹ نہیں دیتی ہے اُن کو
وہ لوگ جو خود اپنے ہی لوگوں سے لڑے ہیں

یہ اشعار ہماری موجودہ معاشرتی افراتفری کی عکاسی کرتے ہیں اور ان

میں ہمارے لئے درسِ عبرت بھی ہے۔ امید کی شاعری میں ایک پیغام ہے اور وہ پیغام ہے اپنی دھرتی سے پیار، امن و آشتی کا پیغام، محبت اور خلوص کا سندیسا۔ انہوں نے وطن سے محبت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی جس عمدگی اور نفاست سے کی ہے ہمیں اس کی داد دینی پڑتی ہے۔

امید کے الفاظ اُن کے اشعار میں جذبات و تاثرات کی تعبیریں ہیں۔ ان کی شاعری پُراعتماد لہجے اور دلی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ یہ وطن کی محبت سے حُسن تراش لینے کا عمل ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی خوبصورت اور توانا شاعری کے مطالعے کے بغیر اس عہد کی قومی شاعری کا مطالعہ ادھورا رہے گا۔

اب ہمیں 'پاکستان زندہ باد' کے ساتھ 'پاکستان پائندہ باد' کا نعرہ بھی بلند کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ملک رہنے والا ہے۔ اللہ اس کا والی ہے۔ اس کے استحکام اور استقلال کے ساتھ اسلامی دنیا کی مضبوطی، سلامتی اور سرفرازی وابستہ ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے 'خطبہ الہ آباد' میں پیشین گوئی کی تھی۔ جغرافیائی طور پر بھی پاکستان دنیا کے نقشے پر مسلم ممالک کی تسبیح میں ایک نیّرِ تاباں دانے کی صورت پرویا ہوا نظر آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کی اس مجوزہ اور متوقع متحد افرادی قوت، معدنی ذخائر کی وافر دولت، کرۂ ارض پر بحری، بری اور فضائی اہم شاہراہوں کے وقوع اور سب سے زیادہ ملّی تشخص اور وحدت سے خوفزدہ ہو کر اقوامِ مغرب نے قیامِ پاکستان کی کھُلی اور پوشیدہ طور پر مخالفت کی تھی۔

پاکستان ہماری خوشیوں کا گہوارہ ہے۔ ہمیں اپنے خون پسینے سے اس

کی آن بڑھانی ہے تاکہ ہم خود بھی آگے بڑھتے جائیں اور تاریخ نے جو فرض ہمارے سپرد کیا ہے اُس سے احسن طریقے سے سبکدوش ہو سکیں۔

'پاکستان رائٹرز گلڈ سندھ، آرٹس کونسل آف پاکستان اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز آف پاکستان کے تعاون سے امید فاضلی کے شعری مجموعے 'پاکستان زندہ باد' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا۔ ۲ اگست ۱۹۸۰ء'

قائدِ اعظمؒ کی حُبّ الوطنی

حُبِّ الوطن از مُلکِ سُلیماں خوشتر
خارِ وطن از سُنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ در مصر پادشاہی کرد
گفت، گدا بودنِ کنعاں خوشتر

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے تقریری اور تحریری دستاویزوں پر مشتمل سید شریف الدین پیرزادہ صاحب کی مرتب کردہ کتاب The Collected works of Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah کی تیسری جلد شائع ہوئی ہے جس میں مارچ ۱۹۲۶ سے جنوری ۱۹۳۱ تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ برطانوی ہندوستان میں آئینی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے پُرآشوب دور تھا اور اسی ہی دور میں ان کا سیاسی نصب العین بھی واضح ہونے لگا۔ مانٹیگو چیمس فورڈ آئینی اصلاحات کے ماتحت برطانوی ہندوستان میں انتخابات ہوئے اور وفاق کے قیام کا ابتدائی خاکہ سامنے آیا۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک علیحدہ اور متحدہ انتظامی یونٹ تشکیل دینے کا مطالبہ کیا اور اس کو برصغیر ہند میں 'اسلامی ہند' کے قیام سے تشبیہہ دی۔ گول میز کانفرنس، لندن میں سندھ کو احاطۂ

بمبئی سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سندھ ہی میں سکھر بیراج کا ۱۳ جنوری ۱۹۳۲ کو افتتاح ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کے تیسرے عشرہ میں مسلمانانِ ہند سیاسی انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔ تحریک خلافت تو ناکام ہو چکی تھی لیکن اس کی وجہ سے جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی اس سے کانگریس اور حکومت برطانیہ دونوں خائف تھے۔ کانگریس مسلمانوں کی سیاسی قوت کو اپنے سوراجیہ مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی اور تاجِ برطانیہ ہندو مسلم نفاق کے پیشِ نظر اپنے سامراجی تسلط کو طول دینا چاہتا تھا۔ بہرحال آئینی اصلاحات کے اجراء کے سلسلے میں ایک کمیشن (سائمن کمیشن) مقرر کیا گیا، جس نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت سے جلسے اور ہنگامے ہوئے اور مسلم لیگ بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

ایک گروہ ترقی پسند عناصر پر مشتمل جناب محمد علی جناح کی رہنمائی میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا حامی تھا اور یہی نظریہ کانگریس کا بھی تھا۔ دوسرے گروپ کو رجعت پسند کہا گیا جو پنجاب کے سر محمد شفیع کی قیادت میں سائمن کمیشن کے سامنے مسلمانوں کا کیس پیش کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ اس میں مسلمانوں کی بہتری کے آثار دیکھتا تھا۔ اپنے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے جناح صاحب نے دہلی میں (مارچ ۱۹۲۷) مسلم زعما کا اجلاس بلایا جس میں بعض تجاویز اتفاقِ رائے سے منظور کی گئیں جو 'دہلی تجاویز' کے نام سے مشہور ہیں لیکن بعد کے واقعات نے ان تجاویز کو نہ صرف غیر موثر بنا دیا بلکہ

ہندوؤں کی مسلم دشمن ذہنیت 'نہرو رپورٹ' کی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آگئی۔ سر آغا خان نے لندن کے اخبار 'ٹائمس' میں اس رپورٹ کے خلاف ایک مدلل مضمون لکھا اور ۲۹ مارچ ۱۹۲۹ کو جب ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں یہ رپورٹ پیش ہوئی تو دوران بحث، میاں محمد شاہنواز خان ممدوٹ، مولوی محمد یعقوب اور جناح صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس طرح کانگریس کے اس دعویٰ کو باطل ثابت کیا کہ 'نہرو رپورٹ' کو مسلمانوں کی تائید حاصل تھی۔ ہندوؤں کی اس متعصبانہ اور معاندانہ روش کی وجہ سے قائد اعظم کانگریس سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مرکزی کونسل، مرکزی قانون ساز اسمبلی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے مسلم اراکین نے ۱۰ ستمبر ۱۹۲۸ کو ایک مشترکہ اپیل جاری کی اور 'کل ہند مسلم کانفرنس' قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ کانفرنس کا پہلا اجلاس ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ کو دہلی میں سر آغا خان کی صدارت میں ہوا۔ کانفرنس کے قیام کا مقصد کسی نئی سیاسی جماعت کی تشکیل نہ تھا بلکہ اس وقت کی مسلم سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد اور تعاون پیدا کرنا تھا۔ یہ جماعت تقریباً سات سال تک مسلمانانِ ہند اور الور اور کشمیر کے مسلمانوں کے مفاد کے لئے کام کرتی رہی۔ اس کے ایگزیکیٹو بورڈ کا آخری اجلاس ۲۴ مارچ ۱۹۳۵ کو دہلی میں حاجی سر عبداللہ ہارون کی صدارت میں ہوا۔ جس کے بعد اس کی علیحدہ حیثیت ختم کی گئی اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کے بعد ایک ہی پرچم کے زیر سایہ مسلمانوں نے قیام پاکستان تک جدوجہد آزادی کی تحریک جاری رکھی۔

اس کتاب کے حوالے سے میں بہت سی ایسی باتوں کی نشاندہی کرسکتا ہوں جن سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ قائد اعظم کو جو مسلمانوں کے مستقبل کی فکر لاحق تھی اس کے ساتھ ساتھ صوبہ سندھ اور یہاں کے مسلمانوں کی پسماندگی کا بھی ان کو بہت خیال تھا اور میں بلا خوف تردید یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ قائد اعظم سندھ کے بڑے محسن تھے اور وہ سندھ کے باشندوں کی ترقی اور سرفرازی چاہتے تھے۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ حیاتِ قائد کے ان واقعات اور عملی اقدامات کو صحیح پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ وسیع پیمانے پر مشتہر کیا جائے تاکہ ان کے سیاسی فہم و فراست اور محب وطن جذبات آشکار ہوں اور جن افراد یا حلقوں کی طرف سے جو باطل دعوے کئے جارہے ہیں ان کا نہ صرف تاریخی اعتبار سے مدلل جواب دیا جائے بلکہ ایسے فکری انتشار اور سیاسی شورشوں کا بھی سدِ باب کیا جاسکے۔

خواتین و حضرات!

صوبہ سندھ کو ۱۸۴۷ میں احاطہ بمبئی سے ملحق کرنے کا اقدام کسی انتظامی امور کی اصلاح کے سلسلے میں نہیں تھا۔ یہ سندھ کے ہندو باشندوں کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی تاکہ مسلم اکثریت کے اس خطے کو جو بلوچستان اور پنجاب سے مل کر ایک ناقابلِ تسخیر سیاسی قوت بن سکتا تھا، اقلیت میں تبدیل کیا جائے جس کے نتیجے میں سندھ کے انتظامی، اقتصادی اور ثقافتی شعبوں میں ہندوؤں کی بالادستی قائم رہے اور مسلمان انگریزوں کی آمد کے بعد رونما ہونے والے سیاسی و سماجی انقلاب سے بے بہرہ رہیں، ناخواندگی اور غیر ہنرمندی کا

کے جال میں پھنسے رہیں اور اپنی حکومت اور عروج کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے خون کے آنسو بہاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ہزیمت کے ماحول میں عمل کی قوتیں اور مستقبل کی فکر سلب ہو جاتی ہے، فرد اور ملت کوئی عملی اقدام اٹھانے کے قابل نہیں رہتے۔

اس سازش کو بار بار بے نقاب کیا گیا اور اس کے خلاف تحریکیں چلائی گئیں جن میں برطانوی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلم رہنماؤں نے ذعمائے سندھ کا ساتھ دیا لیکن یہ عزت و افتخار قائداعظم کے نام لکھا ہوا تھا اور انہیں ہی حاصل ہوا۔

کل ہند مسلم لیگ نے اپنے ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کے اجلاسوں میں برطانوی ہند کے دستور میں مجوزہ تبدیلیوں کے معاملے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ قائداعظم نے اپنے 'چودہ نکات' کے پس منظر کی وضاحت میں ایک کتابچہ تیار کیا جو شاہ بہرام پرنٹنگ پریس، بمبئی میں طبع ہوا۔ جس میں مستقبل کی آئینی تجاویز کے سلسلے میں دوسرے قومی مطالبات کے ساتھ ساتھ احاطہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی فوری ضرورت کا اعادہ کیا گیا تھا۔

۲۰۔ مارچ ۱۹۲۷ کو دہلی میں مسلمان نمائندوں کا اجلاس ہوا۔ ان کی پیش کردہ تجاویز کو 'دہلی مسلم تجاویز' کہا جاتا ہے۔ ان میں بھی سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ سرفہرست تھا۔ کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس میں جو کلکتہ میں دسمبر ۱۹۲۷ کو منعقد ہوا، ان تجاویز کی توثیق کی گئی۔

ایک متفقہ دستور کی تیاری کے سلسلے میں ۱۱۔ فروری ۱۹۲۸ کو دہلی میں

آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جو ۱۱۔ مارچ تک بھی کسی نتیجہ پر پہنچ نہ سکی۔ چنانچہ کل ہند مسلم لیگ کونسل کا دہلی میں اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد منظور ہوئی اور دستوری مسائل کو جلد اور باہمی مشاورت سے حل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے بعد آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاسوں میں کانگریس کے ایماء پر ایک بالکل نیا منصوبہ تیار کیا گیا جس سے مسلم لیگ قطعی لاتعلق تھی اور یہ منصوبہ بعد میں 'نہرو رپورٹ' کی شکل میں ظاہر ہوا جس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اس رپورٹ سے متعلق آل پارٹیز کنونشن منعقدہ کلکتہ دسمبر ۱۹۲۸ میں لیگ ڈیلیگیشن نے جو تجاویز پیش کیں ان میں بھی سندھ کی علیحدگی کی تجویز تھی۔

اسی اثنا میں صورت حال کا ناقدانہ اور مدبرانہ تجزیہ کرتے ہوئے صوبہ پنجاب کے مسلمان رہنماؤں نے نہایت ہی دانشمندانہ اقدام اٹھائے تھے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے حال ہی میں ڈیوڈ پیج کی کتاب Prelude to Partition شائع کی ہے جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں سر فضل حسین کے ایماء اور سرگرم تحریک کے نتیجے میں دریائے سندھ پر سکھر بیراج تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس سے پہلے صوبہ پنجاب ہی کی تحریک پر کراچی بندرگاہ کی ترقی اور روہڑی کے قریب دریائے سندھ پر لینس ڈاؤن ریلوے پل تعمیر ہوا۔ گو یہ اقدام زرعی پیداوار کے نقل و حمل اور تجارتی مفادات کے پیش نظر اٹھائے گئے تھے لیکن باطن میں یہ مستقبل کی مسلم مملکت کے وجود میں آنے کی ابتدائی اور نیم شعوری کوششیں تھیں۔

ہندوؤں کے پاس اس آئینی تجزیہ کی مخالفت کے لئے اور تو کوئی منطقی

اور تاریخی دلیل نہیں تھی اس لئے انہوں نے مبینہ انتظامی دشواری اور مالی عدم استحکام کی بنا پر اس مسئلے کی مخالفت کی اور حکومت بمبئی کے اعلیٰ افسروں سے گٹھ جوڑ کر کے غلط رپورٹیں مرتب کیں سندھ کے عوام کے مطالبہ آزادی کو سبوتاژ کیا اور گول میز کانفرنس کے مندوبین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔

قائداعظم نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے التوا میں پڑا ہوا سکھر بیراج کا منصوبہ، سندھ کو خود کفیل بنا سکتا تھا اور زرعی انقلاب کی وجہ سے مسلمان کسان کی حالت بھی بہتر ہو سکتی تھی اس لئے ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت سے سندھ کا مستقبل روشن تھا۔ چنانچہ ۴۔ فروری ۱۹۲۴ء میں امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں قائداعظم نے سکھر بیراج کے لئے سامان کی خریداری میں تاخیر سے متعلق حکومتِ ہند سے سوالات کئے تھے۔ بعد ازاں وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن نے ۱۲ جنوری ۱۹۳۲ کو اس کا افتتاح کیا لیکن اس سے پہلے ہی نہروں میں آزمائشی طور پر پانی چھوڑا گیا تھا جس کا ذکر سر محمد شفیع (پنجاب) نے گول میز کانفرنس (لندن) کے اجلاس میں کیا تھا۔

سکھر بیراج کی تعمیر کے لئے مرکزی حکومت ہند نے، حکومت بمبئی کی معرفت قرض دیا تھا کیونکہ ایک تو یہ بہت بڑا منصوبہ تھا اور دوسرے یہ کہ حکومت بمبئی حسبِ معمول سندھ میں خوشحالی اور مسلمانوں کی بہبود کے سلسلے میں براہِ راست کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

بہرحال حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو بعض آئینی اصلاحات دینے کے سلسلے میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ سے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ تک لندن میں گول میز کانفرنس

کا انعقاد کیا جس میں برطانوی ہند کے نمائندوں نے بھی شرکت کی ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بہت سی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جن میں سے ایک سب کمیٹی نے ارل رسیل کی سربراہی میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے سوال کا جائزہ لیا۔ اس کمیٹی کی روداد اب ایک کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوئی ہے جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے مسئلے کے حل میں ایک ہی رکاوٹ تھی اور وہ یہ کہ حکومت بمبئی اور ہندو نمائندے اس بات پر اڑے رہے کہ علیحدہ صوبہ سندھ خود کفیل نہیں ہوگا اور یہ کہ وہ دوامی خسارہ کا علاقہ ہوگا۔

اس سلسلے میں سر غلام حسین ہدایت اللہ نے، جو اس وقت بمبئی کونسل کے ممبر تھے اور سندھ کے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور سر شاہنواز بھٹو نے، جو کہ حکومت بمبئی کے نمائندے تھے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سکھر بیراج کی تعمیر کی وجہ سے چند سالوں ہی میں صوبہ سندھ نہ فقط اپنے قرض ادا کر دے گا بلکہ مالی لحاظ سے خود کفیل ہو جائے گا۔ وسیع قطعات اراضی کی فروخت، زرعی پیداوار میں بے پناہ اضافے اور انتظامی اخراجات میں کفایت شعاری کی وجہ سے علیحدہ صوبہ سندھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے گا۔

رسیل کمیٹی کی روداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم نے اپنی آئینی، منطقی اور غیر جانبدارانہ دلائل سے کمیٹی کے فیصلے کو سندھ کے حق میں موڑ دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر سندھ خسارہ کا علاقہ ہے تو حکومت بمبئی خواہ مخواہ اسے اپنے ساتھ ملحق رکھنے پر مصر کیوں ہے؟ میں سندھ کو علیحدہ صوبہ کی حیثیت

ملنے کے حق میں ہوں لیکن بمبئی کے مفاد کے بھی خلاف نہیں ہوں۔ ایک مالی کمیٹی تشکیل دی جائے جو مالی امور کا جائزہ لے۔ چنانچہ کمیٹی نے ہندو اراکین کی سخت مخالفت کے باوجود اس قسم کی سفارش کی اور ۱۹۳۵ کے قانون ہند کے تحت سندھ علیحدہ صوبہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۳۷ کے عام انتخابات میں یہاں مسلم وزارت بنی اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ سکھر بیراج کی تعمیر کی وجہ سے سندھ کی مالی حالت مستحکم ہوئی، جس بنا پر سندھ بمبئی سے علیحدہ ہوا تھا اور برطانوی ہندوستان کے جنوب مغرب کے نواحی صوبہ کی حیثیت سے اس نے متحدہ ہندوستان کے تصور کی شدید مخالفت کی۔ بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد کی وزارتیں مسلم لیگ کی اس طرح ہمنوا نہیں تھیں جس طرح سندھ نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ میں صوبائی مسلم لیگ نے ایک عظیم الشان اجلاس میں اس طرح کی قرارداد منظور کی جس طرح کی قرارداد مارچ ۱۹۴۰ میں لاہور میں منظور ہوئی۔ اس کے بعد سندھ اسمبلی نے ۱۹۴۳ میں اسی قسم کی قرارداد منظور کی اور بعد میں سندھ کی حتمی طور پر پاکستان میں شمولیت کی قرارداد بھی برطانوی ہند میں سب سے پہلے سندھ اسمبلی نے منظور کی۔

خواتین وحضرات!

مجھے یقین ہے کہ اہل قلم اور دانشوروں کے آج کے اجتماع میں بہت سے ایسے بزرگ یقیناً ہوں گے جو کہ صمیم قلب سے اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ بمبئی پریزیڈنسی کے احاطہ سے سندھ کی علیحدگی علامہ اقبال کے اس تاریخی اور بصیرت افروز خطبۂ الہ آباد کے تسلسل میں تحریک پاکستان کا ایک اہم ستون تھا جس کی

تعمیر اور استحکام کا بنیادی پتھر حضرت قائداعظم نے گول میز کانفرنس کے اس اجلاس میں رکھا جہاں سندھ کا مسئلہ زیر بحث آیا اور ارل رسیل نے، جو اس کمیٹی کے چیئرمین تھے، برملا کہا تھا کہ جناح کے استدلال سے متاثر ہو کر میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں کہ سندھ کو احاطہ بمبئی سے علیحدہ کیا جائے۔

مجھے یہ احساس ہے کہ میری چند گزارشات اس کتاب کے زمانی دائرے سے غیر متعلق نظر آتی ہوں گی، لیکن پیش منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر بیان کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ سندھ پاکستان کا اٹوٹ حصہ ہی نہیں بلکہ نخلِ ملت کا ثمرۂ شیریں اور وحدتِ ملی کا جزو لاینفک بھی ہے۔ جزو برائے کل ایک مانا ہوا کلیہ ہے۔ جب کبھی گیسوئے خمدار یا پیچ وخم کی بات ہو گی، لب و رخسار کا ذکر ہو گا، تو دراصل یہ محبوبِ طرحدار کے سراپا اور حسن ہی کا بیان ہو گا۔ سو جزو کی توانائی کُل کے لئے خطرہ کا باعث نہیں ہوتی۔ جزو کی قوت تو کُل کی سالمیت اور استقلال کی دلیل اور ضمانت ہوتی ہے۔

مسلم لیگ کے روحِ رواں قائداعظم ہی تھے جنہوں نے دستوری اصلاحات کی تحریک کے کسی بھی موڑ پر، سندھ کے مسئلے کو فراموش نہیں کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا یعنی سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ نہ کیا جاتا تو سندھ کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا؟ بھارت میں آجکل جو مسلمانوں کی حالت ہے یہاں بھی اسی طرح ظلم و استبداد، جور و جفا، قتل اور غارتگری کا بازار گرم ہوتا۔ سندھ کے عوام ہندوستان کی اکثریت کے غلام ہوتے یا پھر بٹوارے کے زخموں کا دردِ نہاں اور اذیتِ عیاں ہمارا مقدر ہوتا۔ قائداعظم کا یہ ہم پر عظیم احسان ہے۔

ایسے پُرعزم، مستقل مزاج، دوراندیش اور عملی انسان کی زندگی، کردار اور کارناموں کی نہ صرف پوری شرح و بسط سے تشہیر ہونی چاہیئے بلکہ اس کا کوئی عملی نمونہ بھی پیش کرتے ہوئے رہنما مثال قائم کرنی چاہیئے۔

گزشتہ چالیس برسوں کی مروجہ تاریخ محض نعرے بازی، فکر و عمل کے تضادات اور بعض ایسے واقعات کے پلندہ کے روپ میں ہمارے سامنے ہے کہ من حیث القوم نہ تو ہماری انا کو تسکین پہنچی ہے اور نہ ہی عزت نفس مجروح ہونے سے بچ سکی ہے۔

ہمارے مشاہیر کی تاریخ اب تک منضبط نہ ہو سکی ہے اور پاکستان کی تاریخ! ماشاء اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف ہمارا دھیان ہی نہیں۔ حالانکہ بقول ڈاکٹر احمد حسن دانی صاحب، پاکستان کی تاریخ کا مواد اس سرزمین میں تفصیل سے موجود ہے۔ میرے خیال میں اس طرف کم توجہی کا ایک یہی سبب ہے کہ ہم فکری رد کی روانی کو دوسرے فروعی اور ظاہر پسندی پر مبنی رجحانات کے فروغ سے جامد کرنے کی شعوری کوشش کر رہے ہیں۔
اقبال نے اس روش کو نہ صرف پسند نہیں کیا بلکہ اسے بدعت قرار دے کر اسلام میں فکر اور اس کی توسیع کی اہمیت پر زور دیا اور قرآن حکیم کی روشنی میں حیاتِ اجتماعی کے سرچشموں کے اسرار و رموز کو آشکار کیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فکر کی یہ توسیع تو اقوام مغرب کے حصے میں آئی اور ہم مسلمان جنہیں اس کتاب عظیم کا وارث قرار دیا گیا تھا اس میدان میں ان اقوام سے صدیوں پیچھے ہیں۔ ہم جب بھی سائنسی علوم کا ذکر کرتے ہیں تو ابن مسکویہ، رازی، بوعلی سینا

وغیرہ سے آگے نہیں بڑھتے جو صدیوں پہلے ہو گزرے ہیں۔ ہماری فکر کی آخری حد ان ہی محققین کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ہم پر جمود طاری ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہاں توسیع فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب بھی اس جمود کو توڑنا چاہا تو سوال فکر کی احیاءِ نو (Renaissance) کا ہوگا۔ ابھی تو کیفیت یہ ہے کہ

منزلِ مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است (اقبال)

لیکن مغربی اقوام کی فکر بھی عالمِ آفاق (خارجی کائنات) میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ عالمِ انفس (انسانی دنیا) کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھی۔ برٹرنڈ رسل نے Authority and the Individual میں لکھا ہے کہ "ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے لیکن ان انسانی قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں"۔

تنہا سائنس کے انکشاف اور فطرت کی قوتوں کی تسخیر، انسانی مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔ مغرب ہی کے ایک اور مفکر ڈاکٹر میسن (J.W.T. MASON) نے اپنی کتاب CREATIVE FREEDOM میں کہا ہے کہ "ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کارگیری سے اس وثوق کے ساتھ کی کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں"۔

اتنا ہی نہیں کہ اس سے انسانی مسائل کا حل دریافت نہیں ہو سکا،

اس سے انسان تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے اور یورپ کے دانشور اس کی اس تباہی پر ماتم کر رہے ہیں لیکن بے بس ہیں اور اپنی بے بسی کا اعتراف اور اظہار برملا کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ولیم برینڈٹ نے Foundations of Human Conflict میں لکھا ہے کہ

"انسان ابھی اس مقام سے بہت دور ہے کہ وہ سیکھ لے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے؟ انسان ہر جگہ پریشان اور بے یقینی کے عالم میں پھر رہا ہے قدیم اقدار و عقائد ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنے طبیعی ماحول پر اچھا خاصا قابو پا لیا ہے لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا نہیں سیکھا۔"

سید شریف الدین پیرزادہ صاحب کی اس وقیع کوشش کی ستائش میں بہت کچھ کہنے کو دل چاہتا ہے کیونکہ قائداعظم کے متعلق بہت سے ڈاکیومنٹس اور آرکائیوز ہماری غفلتِ عمومی اور بے توجہی کے باوجود کراچی یونیورسٹی، لاہور اور اسلام آباد میں محفوظ ہیں لیکن تحقیق و تدوین کے مرحلے سے ہنوز نہیں گزرے ان بڑے اداروں کے علاوہ بہت سے ایسے حضرات بھی ہیں جن کے پاس اس قسم کا مواد ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ میں اپنی دانست کے مطابق ایک حوالہ دے سکتا ہوں۔ جناب حکیم محمد سعید جنہیں بجا طور پر ہمدردِ ملک و ملت کہا جا سکتا ہے اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں کہ ان کے پاس قائداعظم سے متعلق کافی مواد موجود ہے کیونکہ انہوں نے اس موضوع پر ۱۹۶۹ میں غور کیا

اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے 'قائداعظم لیکچرز' کا اہتمام بھی کیا۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ ان کے پاس اب تک جو کچھ اس سلسلے میں مواد جمع ہے اس کو مرتب کر کے شائع کر دیں۔ یقین جانیے کہ اس قومی خدمت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان کے پاس تمام تر وسائل موجود ہیں۔

علاوہ ازیں ربِّ جلیل کے فضل و کرم سے اب بھی ایسے مجاہدینِ آزادی ہمارے درمیان موجود ہیں جنہوں نے سفینۂ ملت کو تحریکِ آزادی کے بحرِ متلاطم کے خطرناک اور سوہانِ روح تھپیڑوں سے سلامت روی کے ساتھ ساحلِ پاکستان تک پہنچایا چنانچہ ان نیک طینت بزرگوں کے سینوں میں جو تاریخی واردات محفوظ ہیں انہیں قلم و قرطاس کی مدد سے منصۂ شہود پر لانے کے لئے تریت اور موثر اقدام کئے جائیں۔ کسی بھی آزاد قوم کے لئے وطن کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ نظریاتی سرحدوں کا تحفظ عبادت کی طرح اہم فرض کی حیثیت رکھتا ہے اس ضمن میں قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کی مفصل سوانح حیات اور جد و جہد آزادی کی تاریخ کا جلد از جلد مرتب ہونا پاکستان کے حال اور مستقبل کے لئے یکساں طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کام پاکستان کی سب زبانوں میں ہونا چاہیئے۔

مقامِ مسرت ہے کہ حکومتِ پنجاب نے محکمہ اطلاعات و ثقافت میں 'تحریکِ پاکستان' کا ایک علیحدہ سیل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو تحریکِ پاکستان کے کارکنوں کے کوائف اکٹھے کرے گا۔ خدا کا شکر ہے کسی کو تو تحریکِ پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال آیا۔ حالانکہ یہ تاریخ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد

مرتب ہو جانی چاہیئے تھی ۔ زندہ قومیں آنے والی نسلوں کے لئے اپنی قومی جدوجہد کی تاریخ محفوظ رکھتی ہیں تاکہ انہیں پتہ چل جائے کہ ان کے آباد اجداد نے کس قدر قربانیاں دے کر ان کے لئے آزادی حاصل کی تھی ۔ آنے والی نسلوں کے دلوں میں اپنی آزادی کی حفاظت اور قومی تشخص کے اظہار کا جذبہ اسی طرح زندہ و تابندہ رہ سکتا ہے جب انہیں یہ معلوم ہو کہ یہ آزادی کتنی بھاری قیمت دے کر حاصل کی گئی تھی ۔

پنجاب میں بہت سے علمی، ادبی اور تاریخی تحقیق سے وابستہ فعال ادارے کام کر رہے ہیں ۔ ان کی وفاقی امداد میں اضافہ کر کے، دوسرے صوبوں کے اہل علم اور دانشور حضرات کی شمولیت سے ان اداروں کو مزید فعال اور ان کی سرگرمیوں کو قومی سطح تک بڑھایا جا سکتا ہے ۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو دوسرے صوبوں میں بھی ایسے شعبے قائم کئے جائیں ۔ فی الحال تو صورت حال یہ ہے کہ سرحد، پنجاب بلوچستان سے ایسی مطبوعات شائع ہو چکی ہیں جن کے مطالعے سے ان صوبوں میں قائد اعظم کی آمد و رفت، مصروفیات اور فتوحات کا تفصیلی احوال معلوم ہو جاتا ہے ۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صوبہ سندھ میں ابھی تک ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ۔ میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں جلد ہی ضروری اقدامات کئے جائیں ۔

جناب شریف الدین پیرزادہ نے قائد اعظم کے Collected works کی ترتیب و تدوین کا کام اپنے ذمہ لے کر ایک بہت بڑی قومی خدمت کیلئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے ۔ میں جب سندھ مسلم کالج میں طالب علم تھا تو

اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تحریک پاکستان کے متعلق ان سے استفادہ کرتا تھا ۔ ان کی اس علمی سخاوت اور ادب پروری کے نقوش میرے قلب و ذہن پر اب بھی تازہ ہیں کیونکہ جوانی کے زمانے میں ہی میں نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ پاکستان کے حوالے سے سندھ کی سیاسی تاریخ کو مرتب کیا جائے اور اس تاریخ میں قائد اعظم کے احسانات کا بھرپور ذکر ہو ۔ پاکستان ہمارے تشخص کی ایک نہایت ہی واضح اور روشن علامت ہے اور اس علامت کو مضبوط اور طاقتور بنانا ہم سب کا اولین فریضہ ہے ۔

خواتین و حضرات !

سید شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب کے ناشر، رفیق اختر صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے جو بے جا نہیں ہے ۔ میں اس مرد قلندر کو ۲۰ سال سے جانتا ہوں اور انہیں دنیا و مافیہا سے بے پرواہ ہو کر کام کرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ انہیں جہاں مطالعہ کا شوق ہے وہاں اداراتی الجھنوں سے نپٹنا بھی آتا ہے ۔ وہ اچھے ٹائپسٹ ہیں تو مطبع میں ٹائپ سیٹنگ کے ٹیکنیکل کام سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں ۔ اگر آپ ان کا دفتر دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ ایک مختصر کمرے کے حدود اربعہ میں یہ پہلوان نما دانشور کس طرح تاریخی دستاویزات کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں کمال سلیقہ مندی سے کتابی شکل میں پرُوتا ہے ۔ میں نے جب بھی انہیں کام کرتے ہوئے دیکھا تو مجھے ممتاز حسن مرحوم بہت یاد آئے کیونکہ ابتدائی ملاقاتوں کے بعد میں نے اختر صاحب کو ممتاز حسن صاحب کے رفیق کار کے طور پر دیکھا اور مرحوم کو ان کی خوبیوں میں رطب اللسان پایا ۔ مرحوم

ممتاز حسن صاحب کی قائداعظم کے ساتھ عقیدت مندی اور علامہ اقبال سے محبت بے مثال تھی۔ افسوس ہے کہ اس مردِ مومن کی خدمات کا آج کوئی نام لیوا نہیں۔ حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں بے نواؤں کو صاحبِ نوا بنایا اور نظرانداز کئے ہوئے ادیبوں کو صاحبِ کتاب بنایا۔ دنیا فانی ہے لیکن نیکی کا بول ہمیشہ بالا رہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جناب پیرزادہ صاحب اور رفیق اختر صاحب کی باہمی رفاقت سے قائداعظم کے Collected works جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچیں گے اور زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قائداعظم کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں مزید کتابوں کی ترتیب اور اشاعت کا سبب بنیں گے۔

رسولِ رحمتؐ کا فرمان ہے کہ مَن لم یشکر الناس لم یشکر اللہ یعنی جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں ہوگا۔

میں آپ حضرات کا نہایت ہی احسان مند ہوں کہ آپ نے ایک طالبِ علم اور مزدورِ قلم کار کی چند باتیں سنیں۔

(سید شریف الدین پیرزادہ کی مرتب کردہ کتاب The collected works of Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah-vol. III کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر ۲۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو شیراٹن ہوٹل کراچی میں پڑھا گیا)۔

—ooo—

مسلم خاتون اور مسئلۂ امارت

کسی معاشرے کی عظمت کا راز اس کے پُرہجوم شہروں اس کی بلند و بالا عمارتوں اس کی فیکٹریوں کارخانوں اور مشینی طاقت سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی تہذیبی قدروں اور اس کی اخلاقی قوتوں کی امین اس معاشرے کی خواتین ہوتی ہیں۔

اس تاریخی حقیقت سے ہم بخوبی آگاہ ہیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے دنیا میں عورتوں کو کتنا پست اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ سرزمین عرب میں تو عورتوں کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ زمانہ قدیم میں یمن، یونان، روم، ایران، چین اور ہندوستان جیسے ممالک اگرچہ تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کے گہوارے سمجھے جاتے تھے لیکن ان کے یہاں بھی خواتین کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ انہیں جنسِ مطلق، باعث تباہی و بربادی، نجات کی راہ میں رکاوٹ اور معاشرے میں رسوائی کا موجب سمجھا جاتا تھا بعض قوموں میں انہیں تجارتی مال و متاع تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام ہی وہ پہلا نظامِ حیات ہے جس نے جنس، رنگ، زبان اور نسل کے امتیازات کو مٹا دیا۔ عورت کے مکمل ذاتی اور قانونی تشخص کو اجاگر کیا، اس کو زندگی عطا کی، معاشرے میں باقاعدہ اور پُروقار حیثیت دی اور اس کے حقوق کو سرِعام تسلیم کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات کا درس دیتا ہے اور جنس کی بنیاد پر شرف انسانیت میں کوئی فرق و تفاوت روا نہیں رکھتا۔

قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے ہمیں جگہ جگہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر بھی ملتا

ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی بذاتِ خود ایک حیثیت ہے جسے اسلام تسلیم کرتا ہے۔ سورہ احزاب میں تکرار کے ساتھ مرد و زن کا ذکر آیا ہے۔ اسلام میں عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ باہمی رقابت کا نہیں بلکہ تعاون کا ہے۔ سورۂ توبہ (آیت ۷۱) امورِ مملکت میں مردوں کی طرح یکساں طور پر عورت کی شرکت کے جواز کو ثابت کرتی ہے۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور دوسری اقوام کے ساتھ میل جول کی وجہ سے اسلام کے عطا کردہ حقوق کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ خود مسلمان عورتیں اپنے حقوق سے بے خبر ہو گئیں۔

قدیم عربوں کی ایک کہاوت کے مطابق انصاف چیزوں کو ان کی مناسب جگہ دینے کا نام ہے (العدل ان تدع الاشیاء فی امکنتہ) یا یونانیوں نے کہا کہ انصاف یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا جائز حق ملنا چاہئے۔ اس لئے یہ ایک منصفانہ اقدام ہوگا اگر ہم بھی پاکستانی معاشرے میں عورتوں کو ان کا جائز مقام اور صحیح لائحہ عمل (Role) دے سکیں اور انہیں زندگی میں وہ سارے مواقع فراہم کریں جن کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی جیسی عظیم نعمت کے دوران اپنے وہ کام سرانجام ہو سکیں جن کی دورِ حاضر میں ملک اور قوم کو اشد ضرورت ہے۔

ہمارے یہاں زمانہ حال میں بعض لوگوں نے اس خیال سے بے حد فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام پوری زندگی کے لئے ایک مکمل و معین ضابطہ اور نظامِ حیات ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام دین و دنیا کے امور میں اس طرح کی تفریق و تقسیم نہیں کرتا جس طرح بعض راہبانہ قسم کے مذہبی گروہ روا رکھتے ہیں

مگر وہ زندگی کے امور کو مجموعی طور پر دو حصوں میں ضرور بانٹ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آجکل کے معروضی حالات میں دین و دنیا کی یکجائی کے عام تصور کو جان لینے کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام انسانی معاملات میں ایک خاص طرح کی تمیز روا رکھتا ہے۔ ایک طرف انسانی حیات کے وہ معاملات ہیں جن کو قرآن حکیم نے اپنا موضوع بنایا ہے، ان کے حق و ناحق اور نیک و بد پر روشنی ڈالی اور ہماری رہنمائی کی ہے۔ دوسری قسم کے معاملات و مسائل وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے حکیمانہ سکوت برتا ہے اور خود ہم کو کرید کرید کر پوچھنے اور یوں اپنے آپ کو پابند بنانے سے منع فرمایا ہے۔ سورہ المائدہ کی آیات ۱۰۱-۱۰۲ کا یہی مفہوم ہے۔

قرآن حکیم میں عقائد کی اصلاح پر زور ہے۔ عقائد، اخلاقیات اور عبادات کے بعد اگر کسی شعبہ زندگی کے بارے میں کثرت سے احکام ہیں تو وہ معیشت ہے مگر جہاں تک تنظیمِ ریاست اور نظامِ سیاست کا تعلق ہے۔ ہمیں کم سے کم احکام ملتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس ضمن میں قرآن نے فقط ایک حکم دیا ہے۔ 'شاورھم فی الامر' اپنے لوگوں سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔ ایک دوسری جگہ حکم کی بجائے اس کو مسلمانوں کے وصف کے طور پر بیان کیا ہے۔ 'وامرھم شوریٰ بینھم' مسلمان وہ ہیں جو اپنے معاملات باہم مشورے سے طے کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بنیادی اور ہمہ گیر اصول و کلیہ ہے جو اپنے دامن میں عمرانی نوعیت کے کئی ایک سوالات کے جوابات لئے ہوئے ہے۔ مثلاً قرآن و سنت سے یہ دریافت کیا جائے کہ ایک مسلمان ریاست میں صدر (خلیفہ) کو تاحیات منتخب کیا جائے یا

پانچ سات برس کے لئے ؟ یا یہ سوال اُٹھے کہ پارلیمینٹ کے دو ایوان ہوں یا ایک ایوان ؟ یا ووٹ ہر بالغ مرد اور عورت سے لیا جائے یا فقط بالغ مردوں سے ؟ یا فقط تعلیم یافتہ افراد سے یا اَن پڑھ بالغ افراد سے بھی یا یہ کہ عام انتخابات کتنے برسوں بعد منعقد ہوں ؟ یا یہ پوچھا جائے کہ ایک اسلامی ریاست جس میں کئی خطے (صوبے) اور کئی زبانیں ہوں تو ایسی ریاست میں وفاقی نظام قائم کیا جائے یا وحدانی ؟ ملک کی سیاست میں فوج کا کردار کیا ہوگا، عدلیہ انتظامیہ سے آزاد ہوگی یا انتظامیہ کے تحت ؟ اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کی تعداد کتنی ہوگی اور وہ کیسے کام کریں گے ؟ یا آزادیٔ صحافت کا سوال اُٹھایا جائے یا یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ اسلامی ریاست میں مارشل لا لگ سکتا ہے ؟ بنیادی حقوق معطل کئے جاسکتے ہیں ؟ یا یہ کہ ایوانوں کا استحقاق کیا ہوگا ؟ قرآن و احادیث ان بنیادی سیاسی سوالات کے بارے میں خاموش ہیں۔ یہ ان کا سکوتِ حکیمانہ ہے اور ہماری آزادی کا پروانہ ہے۔ یہ معاملات چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ روپ بدلنے والے ہیں اس لئے ایک نظام جو قیامت تک کے لئے فعال، موثر اور ہدایت بخش ہونے کا دعویدار ہو، اس کی اگر تفصیلات مہیا کر دی جائیں تو ایک مدت کے بعد وہ انسانی معاشرے کے لئے غیر موثر ہو کر رہ جائے گا اور اس میں تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی ورنہ وہ نئے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہ جائے گا۔ قرآن نے مشورے کا حکم دے کر گویا بنیاد کا پتھر مہیا کر دیا۔ اس بنیاد پر ہر دور میں خوبصورت اور محکم عمارت کھڑی کرنا مسلمانوں کا کام ہے۔ کیونکہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا ہے آمد و رفت کے وسائل بہتر ہوتے ہیں۔ مواصلات اور اطلاع رسانی میں سہولتیں پیدا ہوتی ہیں

مشورے کا نظام بھی اس نسبت سے بڑھتا اور پھیلتا جائے گا اور زیادہ سے زیادہ لوگ اور دُور دراز کے خطے آسانی سے اس نظام میں پروئے اور سموئے جاسکیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بار بار تدبر، تفکر اور تعقل کی تلقین فرمائی گئی، ان پر حصولِ علم لازم قرار دیا گیا، ان کو حکمت اور روشنی کی طرف بلایا گیا اور بتایا گیا ہے کہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے۔ (پروفیسر محمد عثمان، بحوالہ روزنامہ 'نوائے وقت' کراچی، مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۶ء)

شریعتِ اسلامی کے مطابق عورت کا بنیادی فریضہ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی تربیت کرنا ہے لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسے گھر کی چار دیواری سے نکل کر وہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کو عام طور پر مردوں کے دائرۂ کار میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ ان کاموں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً حکومت کے بڑے بڑے مناصب جنہیں مردوں کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے اور ان عہدوں کے لئے مناسب اور لائق افراد میسر نہیں ہوتے تو اس کمی کو اہل اور ذہین خواتین پوری کرتی رہی ہیں۔ مسلمان معاشرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

عالمِ اسلام میں صرف پاکستان ہی ایسا ملک ہے جہاں بلا جھجک اور دیدہ دلیری سے مذہب کا استیصال کیا جا رہا ہے۔ کردار کے غازی تو خال خال نظر آئیں گے البتہ تحریر و تقریر کے ذریعہ حشر بپا کیا جا رہا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے وزیراعظم پاکستان بننے سے پہلے ہی چند سیاسی قسم کے علما نے یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ عورت اسلامی ملک کی سربراہ نہیں بن سکتی اور اب اسی حلقہ نے اس مسئلہ پر تحریک شروع کی ہوئی ہے اس بحث کی ابتدا تخلیقِ آدم سے کی گئی اور دور دراز کار مباحث کے ذریعے قرآنی آیاتِ کریمہ کی ذاتی پسند کے مطابق تاویلات میں اُلجھتے ہوئے نبوت، خلافت، امامت اور امارت

کے لئے عورت کے عدم جواز میں فیصلہ صادر کیا۔ حالانکہ یہ چاروں مناصب اپنے لغوی معنی میں مختلف ہیں۔ اسی طرح زمان و مکاں کے تقاضوں اور تاریخی حوادث کے مدنظر ان کی عملی تفسیر بھی مختلف رہی ہے۔ بعض انبیاء صاحبِ اقتدار بھی تھے اور بعض صرف مبلغ اور داعی تھے۔ امارت کا تعلق محض دنیاوی امور سے ہے۔ چنانچہ عورت کی حکمرانی کے عدم جواز میں نبوت، خلافت اور امامت کے تصور، فلسفہ اور عملی اساس کو امارت کے جدید تصور کے معنی میں پیش کرنا حسن نیت پر مبنی نہیں۔

۱۹۸۲ء میں مولانا عمر احمد عثمانی (کراچی) کی محققانہ تالیف "فقہ القرآن" کی تیسری جلد شائع ہوئی جو "حقوق و فرائض" پر مشتمل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے حقوق و فرائض بھی آگئے ہیں اور اسلامی معاشرہ میں عورت کی کیا حیثیت اور مقام ہے، اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق و فرائض پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ حال ہی میں مولانا رحمت اللہ طارق (ملتان) کی علمی تصنیف "عورت اور مسئلہ امارت" شائع ہوئی ہے جو مختصر ضخامت کے باوجود مستند معلومات اور منطقی مباحث پر مبنی ہے۔ کتاب کے صفحہ اول پر طارق صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ برصغیر میں ولی اللّٰہی فکر کے بڑے پُرجوش داعی امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے اصول اور نظریات کی روشنی میں فقہا اور محدثین کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں عورت کی امارت اور سربراہی کبھی قابلِ اعتراض نہیں رہی۔

فاضل مصنف نے کتاب کے پہلے باب میں مسلم معاشرے میں عورت کے مقام اور قیادتِ نسواں کی شرعی حیثیت بیان کی ہے۔ اس کے بعد علماء کرام نے عورت کی سربراہی کے خلاف جو کچھ دلائل دیئے ہیں اسے نقل کیا ہے اور خود انہی علما کے تسلیم کردہ اصولوں کے مطابق ان کی تحریروں اور دعووں کو رد کیا ہے۔ ایک مسلمان عورت کو حکمرانی کا اعزاز حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں یہ مسئلہ شریعت میں قطعی طور پر ثابت نہیں کیونکہ اس کے لئے کوئی ٹھوس، فیصلہ کن اور واضح ثبوت نہیں ملتے۔ جو لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں اپنے دفاع میں ایک موضوع اور سیاسی روایت پیش کرتے ہیں۔ لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ (وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جس نے عورت کو مملکت کا والی اور سربراہ بنالیا)۔ اس حدیث کے راوی ابوبکرۃ نفیع بن الحارث ہیں جو طائف میں ثقیف کے غلام تھے۔ ۸ھ مطابق ۶۳۰ء میں جب آنحضرت نے طائف کا محاصرہ کیا تو یہ ایک گھرنی (Pulley) کے ذریعہ اُتر کر مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور نبی اکرمؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔ بصرہ میں ۵۱/۵۲ھ مطابق ۶۷۱/۶۷۲ء میں وفات پائی۔ انہوں نے مغیرہ بن شعبہ (۶۶۶ء) پر ناحق و ناروا گھناؤنی تہمت لگائی اور ثبوت پیش نہ کر سکے جس پر حضرت عمرؓ نے سورۂ نور کی آیت ۴ کے مطابق آئندہ کے لئے اس کی گواہی کو مسترد کر دیا اور ۸۰ کوڑے بھی رسید کر دیئے۔ علامہ ابوبکر ابن عربی محدث نے اپنی کتاب "عواصم القواصم" میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی احتجاجی مہم کو ان کا غلط فیصلہ ثابت کرنے کے لئے یہ حدیث وضع کی گئی تھی۔ بالفرض اگر ایسی کوئی حدیث واقعتاً ہوتی تو حضرت زبیر بن عوام جیسے جلیل القدر صحابی

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کی زیر قیادت 'جنگِ جمل' میں شریک نہیں ہوتے حضرت زبیرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور ہم زلف تھے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے عمومی حکم ثابت کرنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث 'خبر واحد' ہے متواتر یا مشہور حدیث نہیں۔ خبر واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوسکتا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی شہرہ آفاق تالیف 'سیرت النبی' (جلد اول) کے مقدمے (ص ص ۴۶ - ۵۰) میں ابن جوزی اور ملا علی قادری کے حوالے سے درایت کے اصول بیان کئے ہیں جن کے ذریعے احادیث پر تنقید کی جاتی ہے۔ مثلاً

(۱) جو حدیث، کسی مشہور تاریخی واقعہ کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۲) جو حدیث مشاہدات کے خلاف ہو، صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۳) جس حدیث میں معنوی رکاکت پائی جائے جو عربی قواعد سے گری ہوئی ہو وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۴) جس حدیث میں معنوی رکاکت پائی جائے جو نبوت کے وقار کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

ان اصولوں کے مطابق زیر بحث حدیث صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فارس کی تباہی کی بشارت کسی عورت کی سربراہی کے دوران نہیں فرمائی اور تباہئ فارس کسی خاتون کی قیادت کا نتیجہ نہیں تھی۔ ایران کے عادل بادشاہ خسرو اول عرف نوشیروان (۵۳۱م - ۵۷۹م) کے عہد حکومت کے

چالیسویں سال ۲۰ اپریل ۵۷۱م کو آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ نوشیروان کے مرنے کے بعد کسریٰ دوم عرف خسرو پرویز (۵۹۰م) تخت نشین ہوا اور جب ۶۱۰م میں آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو اس کے نام منشور ہدایت ارسال فرمایا۔ پرویز نے نامہ رسولؐ وصول کر کے طیش میں آکر اسے چاک کر ڈالا اور یمن کے گورنر بازان کو لکھا کہ دو آدمیوں کو مدینہ منورہ بھیج کر محمدؐ کو گرفتار کرا کر دار الحکومت مدائن میں پیش کیا جائے۔ ادھر نبی کریمؐ کو جب معلوم ہوا کہ آپؐ کا نامۂ مبارک چاک کر دیا گیا ہے تو آپؐ نے فرمایا مکتوب نبوی چاک نہیں ہوا، سلطنتِ کسریٰ کے ریزے ریزے ہو گئے۔ (بخاری وغیرہ)

مشکوٰۃ میں بخاری اور مسلم کے حوالے سے یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ آپ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر (تباہئ فارس کی پیش گوئی کے بعد) فرمایا۔ آئندہ تم کسریٰ کے خزانوں کے وارث بنو گے۔ گویا آپؐ نے پرویز کے معاندانہ رویّہ پر ہی تباہئ فارس کی اٹل دعا فرمائی۔ اس پیش گوئی میں یہ اضافہ کہیں بھی نہیں ہے کہ فارس پر ایسی تباہی اس وقت آجائے گی جب اس پر عورت حکمران ہوگی!

نیز حقائق و مشاہدات کے منافی مواد پر مشتمل ہونے کی بنا پر یہ حدیث ناقابل تسلیم ہے کیونکہ آپؐ کی مندرجہ بالا پیش گوئی کے نتیجے میں ۶۱۰م سے لے کر آنحضرتؐ کے وصال (۶۳۲م) تک یکے بعد دیگرے کیا مرد کیا عورتیں، بلا امتیاز قہر الٰہی کی بجلیوں سے بھسم ہوتے رہے، تا آنکہ یہ سلسلہ ۲۳ اگست ۶۵۱م میں عہد عثمانی کے دوران یزدگرد کے قتل پر ختم ہوا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آتش پرستوں کے شاہی نسل کی تباہی کی جو پیش گوئی کی تھی وہ حرف بحرف پوری ہو گئی۔ (اقتباسات

بالاختصار از عورت اور مسئلہ امارت، مصنف رحمت اللہ طارق)

یہ روایت ابن بطال، قرطبی اور مہلب کے نزدیک سیاسی روایت ہے، اور امام بخاری نے اس کو لڑائیوں، لشکر کشیوں، خانہ جنگیوں اور فتنہ سامانیوں کے باب میں جگہ دے کر شعوری طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ یہ ایک سیاسی حدیث ہے۔ اس سے نہ تو عقیدے کا اثبات ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی حکم کا استنباط۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کی ربع صدی گزرنے سے پہلے ہی سیاسی احادیث کی وضع تراش کی ٹکسالیں قائم ہو چکی تھیں۔ شام میں حمص، صید اور حلب، اور عراق میں کوفہ و بصرہ اہم مراکز تھے جہاں تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو سیاسی احادیث ڈھلتی اور متعارف ہوتی رہیں۔ ادھر مرکز اسلام سے سینکڑوں میل دور رہنے والے مناقب و مثالب اور سیاسی روایات کی گرم بازاری سے اس قدر حیران اور مبہوت ہو چکے تھے کہ انہیں سمجھ ہی نہ آتا تھا کہ اس خودرو مواد کی بابت حرمین شریفین سے کسی طرح کی تصدیق طلب کر سکتے ہیں چنانچہ اندیشۂ تحقیق سے بے نیاز ہو کر موقع شناسوں نے اپنی اپنی صف کی حمایت اور مخالف کی تنقیص میں وہ جوہر دکھلائے کہ الامان۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے راویوں کی سکونتی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس حدیث کی تمام سندوں کے راوی (مرکز اسلام سے باہر کے یعنی) بصرے کے تھے"۔ اور جس حدیث کو مرکز اسلام (مکہ و مدینہ) والے نہ جانتے ہوں، اس کی بابت امام مالک (۷۹۵م) فرماتے ہیں کہ "جس حدیث کو حجاز سے باہر جنم ملا، اس کا مغز جاتا رہا (وہ بے مغز ہے)"۔ اسی طرح امام شافعی (۸۲۰م) کا ارشاد ہے کہ "جس حدیث کی اصل اور بنیاد حجاز میں نہ پائی جاتی ہو، وہ حقیقت سے

عاری ہے"۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحابہ کرام خصوصاً حضرت طلحہ شہید (۶۵۶م)، زبیر شہید (۶۵۶م)، حضرت عائشہ (۶۷۸م)، سیدنا امام حسن (۶۷۰م) اور سیدنا علی کو معلوم نہ تھی۔ اس طرح اہل حرمین، حضرت علی کی بیس ہزار فوج، حضرت عائشہ کے تیس ہزار ساتھی اور عشرہ مبشرہ کا ایک نازک موقع پر اس حدیث کو نہ جاننا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی ایک آیت (النساء-۳۴) بھی پیش کی جاتی ہے "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ" اور اس کا یہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ حالانکہ قوام کے معنی حاکم نہیں بلکہ ضرورت کا بند و بست کرنے والا، کفیل یا نگران و نگہبان، جیسے مکمل آیت کے ترجمہ اور مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عائلی زندگی اور "تدبیر منزل" (گھریلو مسائل) کے بارے میں ہے اور امور مملکت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا مطلب ہے کہ عورت کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے اور شوہر کے اخراجات کا ذمہ عورت پر نہیں۔ اس وجہ سے عورت کو مرد سے وفادار رہنا چاہیئے۔ قیم اور قیوم کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کی سورہ النمل میں ملکۂ سبا حضرت بلقیس کی حکمرانی اور دانائی کا قصہ بیان ہوا ہے۔ قرآن کریم نے ان کے صاحب اقتدار و اختیار سربراہ مملکت (سبا) ہونے پر کوئی معمولی سی نکیر بھی نہیں فرمائی۔ ان کے ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے انہیں معزول کر کے تخت و تاج سے محروم نہیں

کر دیا، اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ تم عورت ہو کر سربراہ مملکت نہیں بن سکتیں، کسی مرد کو سربراہ بنایا جائے۔ حضرت سلیمانؑ کا ان کے اقتدار و اختیار کو قائم رکھنا اور قرآن کریم کا اس پر کوئی نکیر نہ فرمانا، اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی امامت کبریٰ کے سلسلے میں قرآن مجید کا وہ نقطۂ نظر نہیں جو آجکل بعض علمائے کرام اور شکست خوردہ سیاست دانوں نے اختیار کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں ایسی کوئی آیت نہیں ملی، جسے عورت کے اس حق سے محرومی کی دلیل بنایا جا سکے۔ نیز انبیائے سابقین کی شریعت جسے اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی نکیر کے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہو، اور آنحضرت نے قبول فرمایا ہو، ہمارے لئے بھی شریعت ہوتی ہے اور ہمارے لئے اس کا اتباع اور پیروی ضروری ہوتی ہے۔ (اقتباس بالاختصار از "فقہ القرآن")

امام تفسیر محمد بن جریر طبری فرماتے تھے کہ مسلمان عورت مملکت کے تمام عہدوں پر حاکم و فرمانروا بن سکتی ہے (ہدایۃ المجتہد، جلد دوم صـ۳۴۹)۔ اسی طرح کا ایک فتویٰ مالکی فقہ کے بانی امام مالکؒ سے بھی مروی ہے کہ عورت مملکت کے تمام امور میں بلا شرط و قید سربراہ بن سکتی ہے۔ (ارشاد الساری قسطلانی، جلد دہم، صـ۲۳۲)۔ علامہ کاسانی نے "بدائع الصنائع" (جلد ہفتم، صـ۳) میں لکھا ہے کہ مملکت کے اعلیٰ عہدہ (قاضی) پر فائز ہونے کے لئے مرد ہونا ضروری نہیں ہے۔ عورت بھی قاضی بن سکتی ہے۔ اسی طرح حنفی فقہ کی ایک مشہور اور معتبر کتاب "ردّ المحتار شرح درّ المختار" میں جو "فتاویٰ شامی" کے نام سے مشہور ہے، علامہ ابن عابدین نے حنفی فقہ کے مشہور عالم علامہ بدر الدین العینی کے حوالے سے ثابت

کیا ہے کہ عورت حدود اور قصاص کے معاملات میں بھی قاضی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ (جلد چہارم۔ صـ۳۹۶)

عالم اسلام میں خواتین کا سربراہ مملکت بننا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ گذشتہ تیرہ صدیوں میں عالم اسلام میں بہت سی خواتین نے ملکہ کی حیثیت سے حکمرانی کی ہے مگر لگتا یوں ہے کہ کسی کو یہ باتیں یاد نہیں ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خلائی سائنس اور کمپیوٹر کے اس جدید دور میں ساری دنیا کے کتب خانوں یا تاریخ سے ایسی کتابوں کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے جن میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ عالم اسلام میں بہت سی خواتین سربراہ مملکت اور حکومت رہ چکی ہیں۔ ان خواتین نے ایشیا، افریقہ، یورپ اور دور دراز جزائر انڈونیشیا پر ہی حکومت نہیں کی بلکہ مکہ معظمہ کے انتہائی قریبی علاقے پر بھی حکمرانی کر چکی ہیں۔

تدمر (شام) کی ملکہ زنوبیا نے (۲۶۶ تا ۲۷۲ء) اس خوبی اور مہارت سے حکمرانی کی کہ عربی کلاسیکی ادب کا حصہ بن کر رہ گئی۔ اس نے شام کو رومن ایمپائر کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے متعدد جنگیں لڑیں اور بالآخر بدیسی حکمرانوں کو دیس نکالا دے کر شام اور فلسطین کو آزاد کرا لیا۔ اس کی بابت عرب مورخین لکھتے ہیں کہ اس کے نام کے سکے ڈھالے گئے۔ مملکت تدمر نے اس کے عہد میں خوشحالی اور بلند نام پایا۔

مقتدر کے نابالغ ہونے کی وجہ سے امور خلافت ملکہ شغب (۹۳۳ء) کے قبضے میں آگئے۔ اس کی معتمد لوگوں کی عرضداشتوں سے آگاہ کرتی اور ملکہ اپنے ذاتی دستخط ثبت کرتی۔ جب دیوان عام میں کرسی نشین ہوتیں تو تمام فقہا، قانون دان اور اعیان مملکت حاضر باش رہتے۔

خلیفہ العزیز باللہ کی لڑکی سِتّ الملک (۱۰۲۳ء) جب مصر کے تخت و تاج کی

ملکہ بنی تو علماء نے اس کے خطبے پڑھے۔ اعیانِ مملکت نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بیعت اور اعلانِ وفاداری کیا اور ملکہ نے بھی اپنی تمام توانائیاں رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر کے عدل و انصاف کی حسبِ منشا ایک مثال قائم کی۔

ملکہ اروی (م-۱۰۹۱ء) بنت احمد بن جعفر جسے بلقیس ثانی کہا جاتا تھا، جب ملکہ بنی تو یمن کی تمام مساجد میں اس کے خطبے پڑھے گئے اور دعا میں کہا گیا کہ بارِ الٰہی مسلمانوں کے اس واحد سہارے کو محفوظ اور مستحکم بنا.....

یہ ملکہ یمن سلیحین سلطنت کی آخری ملکہ تھی۔ اس نے صرف روایتی حکومت ہی نہیں کی بلکہ کئی اہم جنگی مہموں کی نگران بھی رہی اور اپنے وطن کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا۔

سلجوقی حکومت ڈیڑھ سو سال تک رہی جس کا رقبہ دیوارِ چین سے قسطنطنیہ کی فصیل تک اور انتہائے شمال سے لے کر یمن کی آخری سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ شاہانِ روم اس کے باجگذار تھے۔ اپنے دور کی یہ سلطنت ترکان خاتون (۱۰۹۳ء) کو ورثے میں ملی تھی۔ یہ ترکوں کے قدیم بادشاہ افراسیاب کی نسل سے تھی۔ ملک شاہ سلجوقی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ جب ۳۸ سال کی عمر پا کر ۱۰۹۱ء میں فوت ہوا تو ترکان خاتون نے اس کی موت کو مخفی رکھا اور لاش کو لے کر اپنے نواسے کے ہمراہ بغداد روانہ ہوئی اور وقت کے پروٹوکول کے مطابق خلیفہ بغداد سے اپنے بیٹے محمود کی سلطنت کی توثیق کرانا چاہی لیکن چونکہ وہ کم سن تھا اس لئے طے یہ ہوا کہ سلطنت محمود کی ہوگی (۲) خطبہ خلیفہ کا اور (۳) حکمرانی کے مکمل اختیارات و مناصب کے عزل اور نصب کی مجاز صرف ترکان خاتون ہوں گی (اقتباس بالاختصار از کتاب خواتین)

ملکہ اسماء بنت شہاب (م-۱۰۵۰ء) قائم مقام ملکہ تھی۔ تمام امورِ مملکت اپنے نام سے چلاتی تھی۔ اس کے نام کے خطبے بمع شوہر کے پڑھے جاتے تھے۔ وہ الحرا (آزاد) کے لقب سے مشہور تھیں۔

ملکہ حرہ (۱۰۵۰ء) نجاح خاندان کی آخری فرماں روا تھی۔ کسی نے اس کے شوہر کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کے بعد مملکت کا تمام کاروبار اس نے چلایا۔ ان کے نام کے خطبے پڑھے جاتے تھے۔

مصر کے بادشاہ نجم الدین کی ایک لڑکی کو تاریخ نے شجرۃ الدر (۱۲۵۷ء) کے نام سے دوام بخشا ہے۔ وہ مصر کے سلطان ایوب کی بیوی تھی۔ اس کی بابت عرب مورخین لکھتے ہیں کہ یہ خاتون زیرکی اور قوتِ ارادی میں اپنا مثیل نہ رکھتی تھی۔ پڑھی لکھی اور مملکت کے حالات پر گہری نظر رکھنے والی بیدار مغز ملکہ تھی۔ اس نے شہرت و رفعت میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ نہ تو اس سے پہلے کوئی عورت کر سکی اور نہ ہی بعد میں امکان ہے۔ مورخ ابن ایاس (م ۱۵۲۴ء) کہتے تھے کہ مساجد اور منبروں پر اس کے نام کے خطبے پڑھے گئے۔ درہم و دینار اس کے نام پر ڈھالے گئے جن کے ایک طرف "ملکۃ المسلمین" کے الفاظ کندہ کرائے گئے تھے۔ یورپ کے نامور حکمران شاہ لوئی نہم نے عالمِ اسلام کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی فوج نے مصر پر حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں کو شکست دینے کی تمام تر منصوبہ بندی ملکۃ المسلمین نے کی تھی۔ مصری علما انہیں احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں انڈونیشیا میں یکے بعد دیگرے کئی خواتین سربراہ مملکت رہیں۔ ان خواتین نے لگاتار چوبیس برس تک بڑے طمطراق کے ساتھ حکومت کی۔ ان.

میں تاج العالم اور نور العالم جیسی نامور خواتین شامل تھیں۔

یمن کی فاطمۃ الشریفہ (۱۴۵۴ء) کو عرب مؤرخین نے ملکۃ العرب والاسلام کے نام سے یاد کیا ہے یعنی عربوں اور اہلِ اسلام کی ملکہ۔ اور لکھا ہے کہ اس نے زیدی مذہب کی اشاعت کے لئے صنعاء سے لے کر ظفار اور صعدہ سے لے کر نجران تک کے دور دراز علاقے فتح کر کے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا ڈنکا بجا دیا تھا۔

ملکہ غالیہ (۱۸۱۴ء) کے تعارف میں جبرتی (۱۸۲۲ء) لکھتے ہیں کہ یہ ملکہ طائف اور نجد کے مابین علاقے تربیتہ کی فرماں روا تھی۔ وہابیت اس کا سرکاری مذہب تھا۔ مذہبی مخالفت کی بنا پر ترکوں اور اہلِ بدعت مصریوں نے متعدد بار چڑھائی کی لیکن ان کا ہر حملہ ناکام رہا۔ طوسون پاشا مصری کہیں سے توپ لائے تھے تب بھی کامیابی نہیں ہوئی اور الٹا سات سو مصری مارے گئے۔ اس ملکہ نے آٹھ سال تک بھیانک مقابلے کر کے حملہ آوروں کو قطعی ہزیمت سے دوچار کر دیا۔

قرآن اور تاریخ کے ان واقعات میں متعدد وجوہات استدلال اور ہزاروں سامانِ عبرت موجود ہیں اور یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فقہائے اسلام نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ وحی الٰہی کے تاریخی واقعات اسلامی احکام کا ماخذ بن سکتے ہیں۔ بنابریں جہاں کہیں قرآن نے ٹھوس یا متبادل پالیسی عطا نہ کی ہو تو قرآن کے واقعات ہر دور میں پالیسی کا کام دے سکتے ہیں۔ طارق صاحب نے لکھا ہے کہ اسلام نے عورت کو انسان محض ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ٹھہرایا ہے، وارث تسلیم کیا، حقوق میں مساوی درجے پر رکھا، عصمت و پاکبازی اور اخلاقی پاکیزگی کے علوی معیار کے لحاظ سے زن و مرد کو ایک ہی سطح کا انسان قرار دے دیا ہے تعلیم و تربیت کے یکساں مواقع عطا کر کے وظائفِ حیات کے اختلاف کو باقی رکھ کر زندگی کے ہر میدان میں عورت کو شرکت کا حق دے دیا اور سچ تو یہ ہے کہ امام ابو محمد علی بن حزم اندلسی (۹۹۴-۱۰۶۴م) کو عورت کی بابت قرآن کی اتنی حوصلہ افزائی دیکھتے ہوئے اپنی عقائدی انسائیکلوپیڈیا 'الفصل' میں پوری جرأت سے لکھنا پڑا کہ عورت مرد سے افضل ہے اور 'عورت بھی صاحبِ وحی والہام ہو سکتی ہے۔'

(بحوالہ مقالاتِ شبلی۔ جلد ۴، اعظم گڑھ۔ ۱۹۳۴ء)

علامہ رحمت اللہ طارق نے لکھا ہے کہ فقہا نے اس بارے میں واضح فتاویٰ اس لئے جاری نہیں کئے کہ مختلف اسلامی ممالک میں ملوکیت کا غلبہ تھا۔ ملوکیت بنفسہٖ خلافِ اسلام تھی لیکن حکومت کے ڈر کی وجہ سے علما حضرات ملوکیت کے خلاف زبان نہیں کھولتے تھے۔ سلطان کے بعد دوسرا بڑا ملکی عہدہ قاضی کا ہوتا تھا۔ (صفحہ ۲۷ بحوالہ بدائع الصنائع) اور حنفی فقہ کے بڑے بڑے فقہا نے عورت کو اس عہدے کے لائق قرار دیا۔ ان کے نزدیک عورت قاضی بن سکتی ہے اور جب وہ مملکت کا بڑا عہدہ حاصل کر سکتی ہے تو وہ سربراہ کیوں نہیں بن سکتی۔

اگر اس بحث کو طول دیا جائے تو ہمیں تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں ایسی خواتین کے تذکرے ملتے ہیں جنہوں نے عسکری میدانوں میں، نظامِ سیاست میں، تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے جو اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ سید امیر علی کی کلاسیک تصنیف 'ہسٹری آف سیراسینز' (ص ۱۹۹، ۴۰۴، ۵۵۱، ۵۶۹، ۵۷۷، ۵۷۸) نیز ایس۔ پی۔ اسکاٹ کی تصنیف 'مورش ایمپائر ان یورپ' میں اور 'کیمبرج میڈیول ہسٹری' کی دوسری جلد میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مسلمان خواتین کے عسکری کارناموں پر ایک کتابچہ تصنیف کیا۔ اسی طرح علامہ نیاز فتحپوری کی کتاب 'صحابیات' اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحریروں میں ہمیں بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ برصغیر کے حوالے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش علما کی رائے کے مطابق بڑے دین دار، نیکوکار اور پرہیزگار انسان تھے اور انہیں خلفائے راشدین کے بعد امتیازی درجہ دیا جاتا ہے۔ نرینہ اولاد ہوتے ہوئے بھی انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کی بیٹی رضیہ سلطانہ کو سلطنت دہلی کی باگ ڈور سپرد کی جائے۔ ان کے پیر و مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بھی یہی دعا کی تھی۔ رضیہ سلطانہ کے تدبر اور شجاعت، خلق اور علم پروری کے بہت سے واقعات تاریخ اور تذکروں میں ملتے ہیں۔ اسی طرح چاند بیبی جو دکن میں ایک ریاست کی سربراہ تھی لیکن اس نے حکومت کا نظام اس خوبی اور عمدگی سے چلایا کہ 'ملکۂ ھند' کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف شہسوار اور جری تھی بلکہ دور اندیش سپہ سالار اور حکمران تھی۔ فن حرب اور حکمرانی کے اصولوں کے علاوہ وہ متعدد زبانوں کی ماہر تھی۔ فارسی، عربی، تلنگی، تامل اور مرہٹی زبان میں بے تکلف گفتگو کر سکتی تھی۔

ان دونوں مسلمان خواتین حکمرانوں کی اگرچہ ان کے درباریوں نے اپنے ذاتی مفادات کی وجہ سے مخالفت کی لیکن کسی عالم دین نے ان کی حکومت کے خلاف فتویٰ جاری نہ کیا بلکہ وہ ان کے نام کے خطبے مساجد میں پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت کسی کو اسلامی غیرت نہ آئی اور کسی نے خارج و عزل کا ارادہ نہ کیا۔

اس ضمن میں 'طبقات ناصری' از منہاج سراج، 'کتاب خواتین' از مولانا

اسلم جیراجپوری اور 'تاریخ ملت' (جلد دہم) از مفتی انتظام اللہ شہابی کا مطالعہ مفید رہے گا۔

برصغیر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی عورت کے سربراہ مملکت بننے کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔

پاکستان کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ 'قرار دادِ مقاصد' جو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی مشاورت سے نامور علما کی معیت میں مرتب ہوئی تھی اور اب ہمارے آئین کا حصہ ہے اس میں بھی عورت کے انتظامی سربراہ نہ بنائے جانے کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ یہی صورت حال ۱۹۵۶، ۱۹۶۲، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۵ء کے دستوروں کی ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر وفاقی شرعی عدالت کا وہ فیصلہ ہے جس کے مطابق مسلمان عورت کی سربراہی کو جائز اور برحق قرار دیا جا چکا ہے۔

پاکستان میں عورت کی سربراہی کے خلاف معترضین میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جنہوں نے صدر محمد ایوب خان مرحوم کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کو بطور صدر منتخب ہونے کی حمایت کی تھی۔ نیز گزشتہ دس برسوں سے عورتوں کی سربراہی میں سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں۔

اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اور علاقائی تنظیموں اور بیرون ملک سفارتخانوں میں مسلمان خواتین پاکستان کی نمائندگی کرتی رہی ہیں۔ اسی طرح وفاقی اور صوبائی سطح پر خواتین گورنر، وزیر، مشیر، یونیورسٹیوں اور ڈویژنوں کی سربراہ کی حیثیت میں کام کرتی رہی ہیں اور اپنے اپنے حلقہ کار میں باصلاحیت اور بااختیار منتظم ثابت ہوئی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ۴۰ برسوں میں ہم نے اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلامی تعلیمات کو روزمرہ کے شعار کی طرح اختیار کرنے کی کوئی مثبت اور عملی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ جب تک پاکستان میں مکمل طور پر اسلام نافذ نہیں ہوتا، فروعی مسائل میں الجھنا ملک کی سلامتی اور قومی یکجہتی کے لئے خطرے اور خسارے کا موجب بن سکتا ہے۔

پاکستان کے عوام اس لحاظ سے بدقسمت ہیں کہ انہیں چالیس سال کے دوران صرف تین بار حق رائے دہی کے استعمال کا موقع ملا ہے۔ تاہم یہ امر قابل تحسین ہے کہ جب کبھی انہوں نے ووٹ دیا تو اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیا اور ان کے فیصلے کو چیلنج نہیں کیا جا سکا۔ ۱۹۸۸ کے انتخابات کے نتائج نے ایک بار پھر عوام کی اصابت رائے اور حق رائے دہی کے استعمال کے شعور کی تصدیق و توثیق کی ہے۔

ان انتخابات کے نتائج بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے نظریات کے مطابق ہیں۔ قائداعظم نے ۱۹۳۸ء میں جو سوچا تھا اور نوجوانوں کو جس کی تلقین کی تھی، وہ پچاس سال کے بعد ۱۹۸۸ میں پورا ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین سے ۵ فروری ۱۹۳۸ کو خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا۔

"لیگ نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کو رجعت پسند عناصر سے آزاد کرایا اور یہ فہم پیدا کیا کہ خود غرضی کا کھیل کھیلنے والے غدار ہوتے ہیں۔ مسلم لیگ نے آپ کو ناپسندیدہ مذہبی عناصر سے آزاد کرایا ہے۔ گو ان میں ایک طبقہ محب وطن اور مخلص مولویوں کا ہے لیکن بہت سے ناپسندیدہ ہیں۔ برطانوی حکومت، کانگریس، رجعت

پسندوں اور نام نہاد مذہبی رہنماؤں کے چنگل سے آزاد ہونے کے بعد میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خواتین کو بھی بے جا اور روایت پرستانہ پابندیوں سے آزاد کرائیں یہ نہایت ضروری ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم مغرب کی برائیوں کی تقلید کریں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ خواتین بھی نہ صرف زندگی کے سماجی بلکہ سیاسی شعبوں میں ہمارا ساتھ دے سکیں"۔

سیاست سے وابستہ چند مذہبی رہنماؤں نے اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ، اسلامی احکام و اقدار سے آگاہ، بہترین قائدانہ صلاحیتوں اور مدبرانہ بصیرت کی حامل ایک ایسی خاتون کے پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہونے پر اعتراض کیا ہے جس کے دل میں حب الوطنی اور عوام کی خدمت کا قابل قدر و ستائش جذبہ موجزن ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عوام کی پسند اور قوم کا انتخاب ہیں اور ان کی قائدانہ صلاحیتوں اور تقرر کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان افراد کو اقتدار کیسے منتقل کیا جا سکتا تھا جو ایک خاتون کے مقابلہ میں انتخابات جیت نہ سکے۔ اگر وہ لوگ یہ اہلیت رکھتے تو کسی خاتون کے وزیر اعظم ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ نومبر ۱۹۸۸ کے انتخابات نے مذہبی رہنماؤں کو رد کر دیا اور آسمانِ سیاست پر جتنے بھی ستارے اپنی ظاہری چمک دمک کی وجہ سے ہنگامہ کا باعث بنے ہوئے تھے، سب کے سب ماند پڑ گئے۔ جس کا مطلب ہے کہ انہیں عوام کی رائے کے خلاف کچھ کہنے کا حق نہیں رہا۔ اب ڈفلیاں اور ڈھول پیٹنے سے کیا فائدہ۔ ایسی بے سود بحث سے پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنانے کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ ایسی بحث کا کیا فائدہ

جس سے اخبارات کے اوراق تو سیاہ ہو رہے ہوں لیکن نتیجہ صفر! بہتر ہوگا کہ اس کی بجائے ہم بنیادی اسلامی قدروں کو فروغ دیں۔ فرقہ بندی ختم کر کے ایک خدا، ایک رسول، ایک دین، ایک قبیلہ، ایک امت کے تصور پر اسلام کے نفوذ اور پاکستان کی سربلندی اور استقلال کے لئے اپنے مجبور و مجبور عوام، مساکین اور غربا کی قسمت بدلنے کی تحریک کریں۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر ہم فلاحی معاشرہ قائم کر سکتے ہیں اور قوم کے اکابر اور امرا کو فروعی تقریبات اور رسم و رواج کی بیجا تقلید میں بے دریغ فضول خرچی پر شرم دلا سکتے ہیں جبکہ لاکھوں انسان نیم فاقہ کشی، علاج کی مشکلات اور تعلیم سے محرومی کے مسائل میں پس رہے ہیں۔ مہنگائی نے قوم کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور عوام کے درمیان اتنا فاصلہ ہو گیا ہے جتنا ایک ہاتھی اور چیونٹی میں۔ اگر ایک خاتون سربراہ یہ کام کامیابی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دے تو ایسے مملکتی نظام کو اسلامی تعلیمات کے منافی کیوں سمجھا جا رہا ہے۔

مارشل لا جبر و اکراہ اور 'لامسئولیت' کے فلسفہ کا نام ہے جبکہ جمہوری نظام میں وہ صدارتی ہو یا پارلیمانی، سربراہ کو جوابدہ ہونا پڑتا ہے جو عین اسلام ہے۔ اس طرح کسی بھی مملکت کی سربراہ اگر عورت ہے تو اس کے اختیارات لامحدود نہیں ہو سکتے۔ اسے پارلیمنٹ اور قانون کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اس کی ذات کی حکمرانی کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ یہاں اس کی پارٹی پوزیشن اگر مضبوط ہے تو بھی تنہا نہیں۔ پارٹی بنیاد پر ہی محدود وقت کے لئے طریقہ کار اختیار کر سکتی ہے۔

ہمارے دور کی مذہبی قیادت کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ وہ آج بھی عورت کی

قیادت کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتی ہے جبکہ مشاہدہ یہ ہے کہ ماضی کے چودہ سو سال سے اسلام اپنے 'مرد' حکمرانوں کے طفیل ہی مسلسل زوال پذیر ہے آج بھی مردوں ہی کی وجہ سے زوال و نکبت کی تصویر بے بسی بنا ہوا ہے۔

ویسے یہ فلسفہ ہے عجیب کہ انگلستان کی ملکہ اور وزیراعظم دونوں عورتیں ہو کر حکم چلائیں، ناروے اور ہالینڈ میں صنف نازک ہی فرماں روا ہو، ہندوستان میں عورت ہی کے دور میں فتوحات اور ایٹمی دھماکے ممکن ہوں، سری لنکا میں ایک عورت ہی کے طفیل امن قائم ہو اور فلپائن کے لوگ جان کی بازی لگا کر ایک عورت ہی کو اطاعت کشی کا محور بنائیں۔ مگر ان ممالک میں نہ تو تباہی و بربادی نازل ہو اور نہ ہی کوئی مذہبی فلسفہ زوال پذیر!

اس کے برعکس یہ مذہبی رہنما ایسے بھی مسلم فرماں رواؤں کی اطاعت کرتے رہے جو یا تو زنخے تھے یا پھر اپنے اوپر درد زہ کی کیفیت طاری کر کے عورتوں کی طرح کراہنے اور چیخنے کی مشق کرتے تھے کیونکہ تھیاکریسی فلسفۂ حیات عورت کا سماجی رتبہ تسلیم نہیں کرتا۔ شریعت غرا نے صرف عورت ہی کو نشانۂ تحقیر بنایا ہے۔ مرد جیسے بھی ہوں واجب تکریم و لائق احترام ہیں۔ مشاہدے کے تناظر میں اس حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ زوال امت کے اسباب جوہری ہوں یا عارضی ان میں علما اور مرد حکمرانوں کا زیادہ عمل دخل رہا ہے۔

عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں دین اور شریعت کی کوئی ممانعت نہیں۔ یہ معاصرانہ بغض اور حسد کی پیداوار ہے۔ یہ حقوق العباد کی بات ہے اور حق بھی ایسا جسے معاشرے اور سیاست کے جدید تقاضوں نے تسلیم کر رکھا ہے۔ آج

عورت کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے اسلام کو اکسپلائٹ کیا جا رہا ہے جبکہ حجتہ الوداع میں دین مکمل ہو چکا تھا، اس کی مبادیات اور اصول سے کائناتِ بشری آگاہ ہو چکی تھی۔ ایسے میں عورت کی سربراہی اگر دین کا مسئلہ ہوتی تو اس کے بارے میں وحی کی ایمائیت اور اشارہ ہونا چاہیئے تھا اور جب تکمیلِ دین کے باوصف معاملہ قابلِ بحث نہیں سمجھا گیا تو معلوم ہوا اس کا تعلق دین سے زیادہ پیش آئندہ ہر دور کے تقاضوں سے ہے ورنہ تو کہنا پڑیگا کہ دین نامکمل تھا، اور پاکستان کے علما اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے تکمیل کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

(اس مقالے کے بعض اقتباسات روزنامہ جنگ کراچی، مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے تھے)

—○○○—

حیات نامہ

نام :- کریم بخش خالد ولد (حکیم حاجی) محمد عثمان میمن۔
(ریٹائرڈ) ڈائریکٹر جنرل (تعلقات عامہ) حکومت سندھ۔

قلمی نام :- حاجی بتول سندھی، جبرئیل ارضی، الھیار، سیف عثمانی، غزالی فقیر، محمود غزنوی، طالب الحق، اجرک پوش۔

تاریخ پیدائش اور مقام :- ۱۵ دسمبر ۱۹۲۸ء- گرھی یاسین (ضلع شکارپور، سندھ)۔

ازدواجی حیثیت اور اولاد :- چار لڑکے اور چھ لڑکیاں۔

تعلیم :- پرائمری اسکول لیونگ ایگزامینیشن سرٹیفکیٹ (سندھ، ۱۹۴۵ء) انٹرمیڈیئٹ گریڈ ڈرائینگ ایگزامینیشن (بمبئی، ۱۹۴۵ء)، میٹرک (بمبئی، ۱۹۴۶ء) بی۔اے (کراچی، ۱۹۵۲ء)۔ صحافت میں ڈپلوما (پنجاب، ۱۹۵۷)۔ سرکاری کاموں کی تشہیر میں ڈپلوما (لندن، ۱۹۶۹ء)۔

پیشہ :- تحریر و اشاعت

دفتر کا پتہ :- پندرھیں صدی ہجری مطبوعات، فلیٹ نمبر ۱/۲، بلاک سی، جیکب لائینس ہاؤسنگ کمپلیکس، کراچی۔ ۴۴۰۰۰، ٹیلیفون معرفت ~~[illegible]~~ 7780040 -

گھر کا پتہ :- ۴/سی، جیکب لائینز ہاؤسنگ کمپلیکس، صدر، کراچی۔
۴۴۰۰۰ ٹیلیفون - ~~[illegible]~~ 7780040 -

صنف :- نثر۔ تاریخ، سیاسیات، ادب، سیاحت اور سوانح۔

تصنیفات

۱۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ سندھی (لطیفیات۔ ۱۹۵۳ء)

۲۔ سندھ میں تعلیم اور امداد باہمی۔ سندھی (سماجیات۔ ۱۹۵۳ء)

۳۔ سندھی صحافت۔ سندھی (صحافت۔ ۱۹۵۵ء)

۴۔ خوشحالی کا دور۔ سندھی (عمرانیات۔ ۱۹۵۵ء)

۵-۶۔ خیرپور کا نیا دور۔ سندھی/اردو (عمرانیات۔ ۱۹۵۹ء)

۷۔ بنیادی جمہوریتیں، حیدرآباد ڈویژن میں۔ انگریزی (عمرانیات۔ ۱۹۶۱ء)

۸۔ آثارِ لطیف۔ انگریزی (لطیفیات۔ ۱۹۶۷ء)

۹۔ سچل سرمست۔ انگریزی (شخصیات۔ ۱۹۷۱ء)

۱۰۔ قلندر شہباز۔ انگریزی (شخصیات۔ ۱۹۷۱ء)

۱۱۔ سندھ کا سالنامہ۔ انگریزی (عمرانیات۔ ۱۹۷۱ء)

۱۲-۲۲۔ عوامی دور۔ گیارہ کتابیں، سندھی (سماجیات، ۷۲-۱۹۷۱ء)

۲۳-۲۷۔ دیہی ترقی۔ پانچ کتابیں، سندھی (سماجیات، ۷۳-۱۹۷۲ء)

۲۸۔ نظارو نینھن جو۔ سندھی (سیرت و شہادت حسین، ۱۹۸۲ء)

۲۹۔ سچل سائیں۔ سندھی (شخصیات۔ ۱۹۸۳ء)

۳۰۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس۔ ۱۹۳۸ء۔ اردو (سیاسیات۔ ۱۹۸۳ء)

۳۱۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس۔ ۱۹۳۸ء۔ سندھی (سیاسیات۔ ۱۹۸۴ء)

۳۲۔ وطایو فقیر۔ سندھی (مزاحیہ ادب۔ ۱۹۸۵ء)

۳۳۔ محمد رسول اللہ ﷺ۔ سندھی (سیرت النبی ﷺ۔ ۱۹۸۷ء)

۳۴۔ ایک قاری کی سرگذشت (اردو ادب۔ ۱۹۸۹)

ترتیب اور تدوین

۱۔ ون یونٹ کے خلاف جدوجہد۔ سندھ یوتھ فرنٹ کے ساتھ۔ انگریزی (سیاسیات۔ ۱۹۵۴ء)

۲۔ ماہنامہ "وادی مہران"۔ سندھی (صحافت۔ ۱۹۵۵ء)

۳۔ مغربی پاکستان کا سالنامہ۔ انگریزی (عمرانیات۔ ۱۹۵۶ء)

۴۔ مغربی پاکستان کا سالنامہ۔ سندھی (عمرانیات۔ ۱۹۶۰ء)

۵۔ مغربی پاکستان کا سالنامہ۔ سندھی (عمرانیات۔ ۱۹۶۱ء)

۶۔ ہاکی سوونیئر۔ انگریزی (کھیل۔ ۱۹۶۱ء)

۷۔ پوئیٹ لاریئیٹ آف سندھ۔ انگریزی (لطیفیات۔ ۱۹۶۱ء)

۸-۱۰۔ گلستانِ لطیف۔ سندھی، اردو اور انگریزی (الگ الگ)۔ (لطیفیات۔ ۱۹۶۲ء)

۱۱۔ معرکۂ ستمبر۔ سندھی (رزمیہ شاعری۔ ۱۹۶۵ء)

۱۲۔ آزادی کے لئے جدوجہد کا تصویری البم۔ انگریزی (تاریخ/سیاسیات۔ ۱۹۷۰ء)

۱۳۔ سچل سرمست۔ سندھی/اردو (شخصیات۔ ۱۹۷۰ء)

۱۴-۱۶۔ پیامِ لطیف۔ سندھی، اردو اور انگریزی (الگ الگ) (لطیفیات۔ ۱۹۷۱ء)

۱۷-۲۱۔ نیا پاکستان۔ پانچ کتابیں، سندھی (سیاسیات۔ ۷۲-۱۹۷۱ء)

۲۲۔ دی پوئیٹ آف پیپل، انگریزی (لطیفیات۔ ۱۹۷۳ء)

۲۳۔ لطیفی تحریک۔ سندھی (لطیفیات۔ ۱۹۷۷ء)

۲۴۔ شاہ جو رسالو، سندھ کی تاریخ کا ماخذ۔ سندھی (لطیفیات۔ ۱۹۷۸ء)

۲۵۔ ..... آیتون آھین۔ سندھی (لطیفیات۔ ۱۹۷۹ء)

۲۶-۲۷۔ شاہ نامہ۔ اردو/سندھی (الگ الگ)۔ (لطیفیات۔ جنوری ۱۹۸۰ء)

٢٨-٢٩- لطیف نامہ- سندھی/اردو (الگ الگ)- (لطیفیات- دسمبر ١٩٨٠ء)

٣٠-٣١- شاہ عبداللطیف بھٹائی، احوال و افکار- سندھی/اردو (الگ الگ) (لطیفیات- ١٩٨١ء)

٣٢- سچل سرمست- سندھی/اردو (شخصیات- ١٩٨٢ء)

٣٣- نذرِ لطیف- سندھی/اردو- (لطیفیات- ١٩٨٢ء)

٣٤- فکرِ لطیف- اردو/سندھی- (لطیفیات- ١٩٨٣ء)

٣٥- سچل سائیں- سندھی (شخصیات- ١٩٨٣ء)

٣٦- ذکرِ لطیف- اردو/سندھی (لطیفیات- ١٩٨٤ء)

٣٧- سچل سائیں- اردو/سندھی (شخصیات- ١٩٨٤ء)

٣٨- پیغامِ لطیف- سندھی/اردو (لطیفیات- ١٩٨٥ء)

٣٩- سچل سائیں- اردو/سندھی (شخصیات- ١٩٨٥ء)

٤٠- صاحبِ سیف و قلم- نواب بہادر یار جنگ- اردو (شخصیات- ١٩٨٥ء)

٤١- ماہنامہ 'پیغام' سندھی- (ادب- ١٩٧٦ء سے ١٩٨٦ء تک)

٤٢- ماہنامہ 'پیغام' اردو- (ادب- ١٩٧٦ء سے ١٩٧٨ء تک)

٤٣- ماہنامہ "اظہار"- اردو (ادب ١٩٧٨ء سے ١٩٨٦ء تک)

٤٤- سہ ماہی 'خبرنامہ الزکوٰۃ'- اردو/سندھی (١٩٨١ء سے ١٩٨٦ء تک)

زیرِ طبع

١- مطالعے (اردو)

٢- تحریریں (اردو)

٣- مسلم مشاہیر- (سندھی)

٤- سندھی ثقافت- (سندھی)

٥- نیرنگِ خیال- (سندھی)

٦- سندھی صحافت (نظرِ ثانی شدہ)- (سندھی)

٧- پاکستان جنت نشان- (سندھی)

٨- اقبال کا پیغام- (سندھی)

٩- قائدِ اعظم محمد علی جناح- (سندھی)

١٠- سندھ کے صوفی دانشور- (سندھی)

١١- علامہ آئی آئی قاضی- احوال و افکار- (سندھی)

١٢- حیات النبیؐ (سیرت النبیؐ کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ کے منتخب مضامین کا سندھی ترجمہ)

١٣- فکر و عمل (جناب اے- کے بروہی کے منتخب مضامین کا سندھی ترجمہ)

١٤- شاہ جو رسالو- تاریخ سندھ کا ماخذ (سندھی)

١٥- سندھ- اے پروفائل (انگریزی)

ادبی اور سماجی سرگرمیاں

رکن، سندھی ادبی سنگت (نورالدین سرکی دور)، جوائنٹ سیکریٹری، سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی (دوسرا دور)، ممبر، پی-ای-این (P.E.N) کراچی شاخ (پہلا دور)، رکن پاکستان رائیٹرس گلڈ، رکن، سندھ گریجوئیٹس ایسوسی ایشن، رکن، مرکزی بورڈ برائے فلم سینسرس (کراچی، برانچ)، برا

دلپسند مشغلے

مطالعہ، سیر سفر، ڈاک کے ٹکٹ اور سکے جمع کرنا-

۴۔ سندھی ثقافت۔ (سندھی)

۵۔ نیرنگ خیال۔ (سندھی)

۶۔ سندھی صحافت (نظر ثانی شدہ)۔ (سندھی)

۷۔ پاکستان جنت نشان۔ (سندھی)

۸۔ اقبال کا پیغام۔ (سندھی)

۹۔ قائداعظم محمد علی جناح۔ (سندھی)

۱۰۔ سندھ کے صوفی دانشور۔ (سندھی)

۱۱۔ علامہ آئی آئی قاضی۔ احوال وافکار۔ (سندھی)

۱۲۔ حیات النبیؐ (سیرت النبیؐ کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ کے منتخب مضامین کا سندھی ترجمہ)

۱۳۔ فکر وعمل (جناب اے۔ کے بروہی کے منتخب مضامین کا سندھی ترجمہ)

۱۴۔ شاہ جو رسالو۔ تاریخ سندھ کا ماخذ (سندھی)

۱۵۔ سندھ۔ اے پروفائل (انگریزی)

ادبی اور سماجی سرگرمیاں

رکن، سندھی ادبی سنگت (نورالدین سرکی دور)، جوائنٹ سیکریٹری، سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی (دوسرا دور)، ممبر، پی۔ای۔این (P.E.N) کراچی شاخ (پہلا دور)، رکن پاکستان رائیٹرس گلڈ، رکن، سندھ گریجوئیٹس ایسوسی ایشن، رکن، مرکزی بورڈ برائے فلم سینسرس (کراچی، برانچ، برا

دلپسند مشغلے

مطالعہ، سیر سفر، ڈاک کے ٹکٹ اور سکے جمع کرنا۔

انعامات

۱۔ سندھ گریجوئیٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے 'پیر حسام الدین راشدی گولڈ میڈل'۔ کتاب نظارو نیننھہ جو (۱۹۸۲ء)۔

۲۔ انجمن مصنفین پاکستان کی جانب سے انعام برائے بہترین علاقائی ادب۔ کتاب۔ نظارو نیننھہ جو (۱۹۸۲ء)۔

۳۔ انجمن مصنفین پاکستان کی جانب سے انعام برائے بہترین علاقائی ادب کتاب سچل سائیں، (۱۹۸۳ء)۔

۴۔ تنظیم فکر و نظر ایوارڈ (۱۹۸۵ء)۔

۵۔ سچل سرمست طلائی تمغہ برائے بہترین سندھی مقالہ بعنوان 'سچل سائیں اور مستشرقین'۔ (۱۹۸۵ء)۔

۶۔ تحریک پاکستان اعزازات، ۱۹۸۷ء (نقد ایوارڈ، درجہ اوّل)۔

۷۔ طلائی تمغہ بسلسلہ سندھ گورنرز جوبلیشس ایوارڈ ۸۷-۱۹۸۶ء برائے تحقیقی مقالہ بعنوان 'سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی، مسلمانوں کے اتحاد کی علامت'۔

۸۔ پاکستان کریسینٹ یوتھ آرگنائیزیشن (سندھ برانچ) کی طرف سے بہترین صحافتی خدمات پر 'نشان تحسین' ۱۹۸۸ء۔

۹۔ ینگ مین ڈاکٹرس ایسوسی ایشن، کراچی کی جانب سے ادبی تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات پر 'قائداعظم گولڈ میڈل' ۱۹۸۸ء۔

۱۰۔ وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان، اسلام آباد کی طرف سے کتب سیرت النبیؐ کے مقابلے برائے سال ۱۹۸۸ء میں سندھی کتاب 'محمد رسول اللہ' پر اول انعام مبلغ ۰۰۰ روپے اور توصیفی 'سند امتیاز'۔ ۱۹۸۸ء۔